ہفت روزہ

۱۷ر ستمبر ۱۹۹۲ء

ندائے خلافت

لاہور

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

اس میں تو پاکستان کے وجود اور مستقبل کے بارے میں امید و بیم کے درمیان ایک کشمکش کا عکس ہے۔

(تذکرہ و تبصرہ)

اسلام کا جہان نو کیسے پیدا ہو گا؟

اسلامی تحریکوں اور مغرب کا ٹکراؤ —

— مغربی دانشوروں کی سوچ کیا ہے؟

(تجزیہ)

انقلاب کا غلط فلسفہ!

سیفؔ انداز بیاں بات بدل دیتا ہے

ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

(فاضل معترض کے جواب میں دوسری تحریر)

قوم کو کھلونوں سے

کب تک بہلایا جائے گا؟

اسلام کا جو تھوڑا بہت بھرم تھا وہ ضیاء دور میں جاتا رہا

فضل کریم عاصم ۔ ایم اے

کہتے ہیں جس دور میں اولمپک طرز کے کھیلوں کا آغاز ہوا یونان میں بڑے ظالم حکمران تھے جو عوام کا ہر طرح کا استحصال اپنا حق سمجھتے تھے ۔ بھوک ' افلاس اور ظلم و جور کی چکی میں پستے ہوئے عوام جب احتجاج و بغاوت پر آمادہ ہوتے تھے تو حکمرانوں کی طرف سے نت نئے کھیلوں کے آغاز کی منادی کرادی جاتی تھی ۔ بڑے بڑے ارینے کھیلوں کے لئے بنائے گئے تھے جہاں لوگوں کو اکٹھا ہونے کو کہا جاتا تھا ۔ کھیل دیکھنے کی دیوانگی عوام کو کچھ دیر کے لئے بھوک اور قحط سے بیگانہ کردیتی تھی ۔ خوفناک اور جان لیوا کھیل موت سے بھی بھیانک ہوتے تھے مثلاً آٹھ گھوڑ سواروں کا بیک وقت اس تنگ راستے سے گزرنا جہاں سے صرف دو سوار بمشکل گزر سکتے تھے ۔ اس طرح جو انسان ' گھوڑے اور دوسرے جانور خطرناک کھیلوں میں موت سے ہمکنار ہوتے تھے انہیں کسی اور خفیہ جگہ لیجایا جاتا تھا پھر ان سب کا مشترکہ قیمہ اور گوشت بھوکے عوام میں تقسیم کردیا جاتا تھا ۔ اس طرح عوام کا کھیلوں کا شوق بھی پورا ہوتا رہتا تھا اور ظالم حکمران اپنے عوام کے احتجاج سے بھی بچتے رہتے تھے ۔

یہ واقعات تو ہزاروں سال پہلے ہوئے ہونگے ۔ آج کی جدید دنیا میں بھی کھیل کود اور راگ رنگ کی بدولت قوموں کا استحصال ہوتا ہے لیکن اس کے طریقے اس قدر مہذب ہیں کہ ہر کوئی دل و جان سے انہیں قبول کرلیتا ہے ۔ ابتلا و آزمائش اور اتار چڑھاؤ ہر قوم کو درپیش ہوتے ہیں لیکن پاکستانی قوم اس معاملے میں شاید سب سے آگے اور حقیقتاً سب سے زیادہ سخت جان ہے ۔ آزادی سے لے کر اب تک اسے مسلسل ابتلاؤں کا سامنا ہے ۔ پھیلتے ہوئے ناسور کی طرح رشوت و سفارش اندر ہی اندر اسے کھائے جارہی ہے ۔ مہیب قسم کی بیکاری (جو کساد بازاری کی بجائے غلط منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے) اور جان لیوا مہنگائی نئی پود کے مستقبل کو نگل رہی ہے ۔ نوجوان طبقہ جو پاکستان کا مستقبل ہے چند مفاد پرست سیاست دانوں اور سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں ہیروئن کی آگ میں جل رہا ہے ۔ لسانی نفرتیں صوبائی عصبیتیں اور کھلم کھلا تخریبی سرگرمیاں اسلام کے نام پر لگائے ہوئے اس پاکستانی پودے کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں ۔ جبکہ ارباب حل و عقد کے پاس ان سب مشکلات سے نبٹنے کے درج ذیل طریقے رہ گئے ہیں ۔

حالات ٹھیک ہونے کے زیادہ سے زیادہ بیانات دینا اور مخالفین کی طرف سے اٹھنے والے اعتراضات کا بلا تاخیر ایسا مدلل جواب دینا کہ جھوٹ سچ معلوم ہونے لگے ۔

عوام کو ان کے روشن مستقبل اور جلد آنے والی خوشحالی کے بارے میں تسلسل سے بتاتے رہنا تاکہ وہ حسین دعووں کے بل بوتے پر وقت گزارتے رہیں ۔

ہر قسم کے کھیلوں کو اس قدر فروغ دینا کہ قوم کا وافر طبقہ انہیں میں مگن رہے اس طرح پوری قوم فکر دنیا اور فکر معاد سے بیگانہ ہو کر رہ جائے ۔ اندرون اور بیرون ملک میچ اور ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر اس سلسلے میں کافی کامیاب رہی ہے ۔

ذرائع ابلاغ اور خصوصاً ٹیلی ویژن کے پروگرام زیادہ سے زیادہ رنگین اور دلچسپ بنانا ۔ ویسے تو قوم کو پی ٹی وی اور بھارتی دوردرشن نے ہی موجودہ جدید ثقافت سے کافی حد تک روشناس کروایا تھا اب رہی سہی کسر پی ٹی این کے پروگرام پوری کررہے ہیں ' ہیجان خیز اردو انگریزی فلمیں اور ڈرامے ' بھڑکیلے اور حیا سوز اشتہارات اور سازو آواز کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بچوں اور بچیوں کو گائیکی سکھانے کے پروگرام اتنی دلچسپی کے سامان مہیا کردیتے ہیں کہ دنیا اور دین کے دوسرے معاملات میں دلچسپی لینے کا وقت ہی نہیں بچتا ۔

پچھلی ساڑھے چار دہائیوں سے پاکستانی قوم کا جس قدر سیاسی ' معاشی ' معاشرتی ' مذہبی ' اخلاقی اور ثقافتی استحصال ہو رہا ہے شاید ہی کوئی دوسرا ملک یا قوم اس کی مثال پیش کرسکے ۔ اس میں ایوب خان کا مارشل لا کے ذریعے آئینی انہدام ہو یا عائلی اختراعات ' ذوالفقار بھٹو کے تھیلے میں چھپی رہ جانے والی معاہدہ تاشقند کی بلی ہو یا کبھی نہ پورے ہونے والے روٹی کپڑے اور مکان کے وعدے یا پھر ضیاء الحق صاحب کے ہاتھوں اسلامی اصطلاحات کو بے دریغ استعمال کر کے اسلام کا استحصال ہو ' پاکستانی قوم کو مایوسیوں ' ناکامیوں اور دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں مل سکا ۔ اگر ملا تو قرضوں کا بوجھ جیسے کسی نحیف و نزار انسان پر پہاڑ لاد دیا جائے کہ اب ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر اس کا وزن کم کرسکتے ہو تو کرتے رہو ۔

مرحوم ضیاء الحق صاحب کی مجلس شوریٰ زکوٰۃ و عشر آرڈیننس ' حدود آرڈیننس ' قصاص و دیت ' نظام احتساب ' زکوٰۃ کمیٹیوں کے قیام کمیٹیوں اور شرعی عدالتوں سے قوم یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اسلامی نظام نافذ ہوگیا ہے ۔ قرآن و سنت کی حکومت نافذ ہونے کے ساتھ ہی اسلام کی برکات کی بارش ہونے لگے گی اور لوگوں کے معاشی ' معاشرتی اور دینی مسائل حل ہونے لگیں گے ۔ رشوت ' سفارش ' بیکاری ' مہنگائی ' چوری ' قتل و غارت اور خوف و ہراس کی حالت سدھر جائے گی

(باقی اندرونی سرورق کے دوسری جانب)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور

جلد ۱ شمارہ ۳۳
۷ر ستمبر ۱۹۹۲ء

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷-اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد۔ طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ -/۳ روپے

سالانہ زرِ تعاون (اندرونِ پاکستان) -/۱۲۰ روپے

زرِ تعاون برائے بیرونِ پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت	۱۶ر امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش	۱۲ر " "
افریقہ، ایشیا، یورپ	۱۷ر " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا	۲۰ر " "

افتتاحیہ

سود کا متبادل؟

وفاقی شرعی عدالت کے تاریخی فیصلے کے بعد سے وطن عزیز میں سود کے مسئلے پر بیت بازی کا ایک مقابلہ سا چل رہا ہے جس میں حکومت ' سرمائے کا جوا کھیلنے والے خواص اور وہ عوام 'ایک طرف ہیں جن کے منہ کو حرام کا چسکا لگادیا گیا ہے تو علما اور رجال دین دوسری طرف ۔ اس بیت بازی کے پردے میں حکومت درون خانہ اس سعیء نامشکور کے لئے وقت بھی حاصل کررہی ہے کہ فاضل عدالت کے قول فیصل کو کسی نہ کسی طرح غیر موثر بنا دیا جائے' عدالتی چارہ جوئی سے یا حیلہ سازی اور بہانہ بسیار سے۔ وزیر مملکت سردار احمد آصف علی کی بد نصیبی کہ فریق اول کی ترجمانی کا فریضہ ان کے سپرد ہے ۔ وہ ہیں تو قصور کے لیکن بے قصور ہیں کہ وزارت کی نوکری بجا لارہے ہیں' ہز ماسٹرز وائس ہیں اور وہی کچھ کہنے پر مجبور ہیں جس کا اشارہ "اوپر سے" انہیں ملتا ہے ۔ پچھلے دنوں انہوں نے مبارزت طلبی کے انداز میں پھر ایک نعرہ مستانہ لگایا اور اس بار ان کے نعرے میں خلاف معمول کچھ زیادہ ہی جراءت رندانہ کا مظاہرہ تھا۔ انہوں نے اسی مصرع پر کہ رجال دین کی طرف سے سود کا کوئی متبادل پیش نہیں کیا گیا 'گرہ یوں لگائی کہ عدالت عظمیٰ کو چاہیے کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف دائر کی جانے والی اپیلوں کو پذیرائی بخشے ورنہ ہم مجبور ہوں گے کہ خود وفاقی شرعی عدالت کی ہی چھٹی کرادیں۔ پھر بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔

سردار احمد آصف علی کے دعوے پر تو ہم گفتگو کرنے بیٹھے ہی ہیں ' ان کی دھمکی قانون کی زبان میں وفاقی شرعی عدالت اور عدالت عظمیٰ کی بیک وقت توہین شمار کی جانی چاہیے تاہم یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ۔ ان کا دعویٰ وہی ہے جو اکثر وہ پیش کرتے اور پھر حوالی موالی کی طرف ہمیشہ داد طلب نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ "سود کے متبادل" کو اس طائفہ نے رجال دین کی چھیڑ بنا لیا ہے جس کا ترت جواب آتا تو ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اور فلاں فلاں نے سود کا متبادل پیش کردیا ہے لیکن اس کی حیثیت "جاٹ رے جاٹ ' ترے سر پہ کھاٹ" کے مقابلے میں "تیلی رے تیلی ' ترے سر پر کولھو" سے زیادہ موزوں نہیں ہوتی۔ اس پس منظر میں اگر وہ جواب پڑھا جائے جو پچھلے جمعہ کو امیر تنظیم اسلامی پاکستان ' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں اپنے خطبہ میں دیا تو وہ دندان شکن ہی نہیں ' بالکل نیا بھی لگتا ہے ۔ اس کا لب و لہجہ معذرت خواہانہ نہیں بلکہ تحدیانہ ہے اور مدافعانہ نہیں ' جارحانہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے خوب کہا کہ سودی مالیاتی نظام کا متبادل تو ہو سکتا ہے اور متعدد حلقوں کی طرف سے پیش بھی کیا جاچکا ہے لیکن سود کا متبادل کوئی نہیں' سود کا متبادل سود ہی ہے جیسے زنا کا متبادل صرف اور صرف زنا ہے ۔ انہوں نے یہ وضاحت کر کے بات بالکل صاف کردی کہ نکاح کو زنا کے متبادل کے طور پر پیش کرنے والے دین ہی کی نہیں 'اصول معاشرت کی حکمت سے بھی بے خبر ہیں ۔ نکاح اور زنا دونوں سے آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں اگرچہ اپنی ایک ہی فطری ضرورت کو پورا کرنے کا سامان کرتے ہیں لیکن اول الذکر میں اس کے منطقی نتائج اور متعلقہ معاشرتی ذمہ داریوں کو باوقار انداز میں دائم نبھانے کا ارادہ اور قرینہ موجود ہوتا ہے جبکہ موخر الذکر صرف حیوانی خواہش کی تکمیل لیکن اس کے انسانی تقاضوں سے اعراض کا نام ہے ۔ اس عظیم فرق و تفاوت کے ہوتے ہوئے یہ باہم ایک دوسرے کے متبادل کیسے قرار دیئے جاسکتے ہیں ۔ بالکل اسی طرح سرمایہ کاری کے عوض ایک متعین شرح سے محض منافع طلب کرنے والوں سے اگر یہ کہا جائے کہ شراکت و مضاربت سود کا متبادل ہے تو کہنے والے نے اگرچہ اپنے تئیں تیر مارا لیکن اس طفلانہ استدلال کا سود خوروں پر کوئی اثر نہ ہوگا جو خطرہ مول لینے کے عادی ہی نہیں رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ملک کے دفاع کی ضروریات پورا کرنے کے لئے حکومت اگر اہل وطن سے قرض طلب کرتی ہے تو اس پر غیر معمولی بھاری شرح سے سود کی پیش کش اور ساتھ ہی اسے ملک و قوم کے دفاع کے مقدس فرض کی ادائیگی قرار دیتے ہوئے "آم کے آم ' گٹھلیوں کے دام" کے عنوان سے مشتہر کرنا بڑا ہی سنگین مذاق ہے اور جو لوگ اس سکیم میں سرمایہ کاری کرتے ہیں ' ان سے بڑھ کر شقی القلب کون

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

جب آزمایا تیرے رب نے ابراہیم کو کئی باتوں میں تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں' فرمایا میں تمہیں تمام لوگوں کا پیشوا بناؤں گا'

کہا اور میری اولاد میں سے بھی؟ فرمایا میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے ○

سورۃ البقرہ

(آیت ۱۲۴)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار قسم کے امتحانات سے دوچار کیا۔ عہدِ جوانی کے آغاز سے لے کر بڑھاپے کی آخری سرحدوں تک ان کی پوری زندگی امتحانات اور آزمائشوں سے عبارت تھی۔ شرک اور کفر کے اندھیاروں میں توحید کی شمع روشن کرنے اور بت کدے میں اذان دینے والے نوجوان ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت کو جانچنے اور انکی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے اسے ایک سے ایک کٹھن امتحان سے دوچار کیا گیا۔ وہ معرفتِ حق کے امتحان سے کامیاب نکلے تو بتوں کو پاش پاش کرنے کی پاداش میں انہیں آگ کے الاؤ میں کود جانے کا حکم ہوا۔ آتش نمرود سے سرخرو ہو کر نکلے تو ایک جابر بادشاہ کے سامنے پیشی کا امتحان ان کا منتظر تھا۔ بادشاہ کو مبہوت کر کے اور دلیل کے میدان میں اس کے چھکے چھڑا کر یہ بازی جیتی تو ایک اور بہت بڑا امتحان سر پر آن کھڑا ہوا۔ توحید کی خاطر گھربار اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن عشق کے کئی اور امتحانات ابھی باقی تھے۔ مکہ کی بے آب و گیاہ اور قطعی طور غیر آباد وادی میں اپنی ایک بیوی اور بڑھاپے کی اولاد اپنے شیر خوار اکلوتے بچے یعنی حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو تن تنہا اور بے آسرا چھوڑ کر جانے کا حکم ہوا تو بھی پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور صرف اور صرف اللہ کے سہارے انہیں چھوڑ کر عازم فلسطین ہوئے۔ لیکن اس بوڑھے باپ کا ایک انتہائی کٹھن بلکہ سخت ترین امتحان ابھی باقی تھا۔ سو سال کی عمر میں اپنے تیرہ سالہ سعادت مند فرزند کی گردن پر چھری چلانے کا حکم ہوا' اس فرزند کی گردن پر جو بڑی دعاؤں اور التجاؤں سے اللہ سے حاصل کیا تھا اور جوان کی تمام تمناؤں کا واحد مرکز تھا' تو اس حکم کی تعمیل سے بھی دریغ نہ کیا اور جب اس عظیم اور آخری امتحان میں بھی جس پر ممتحن بھی پکار اٹھا تھا کہ یہ امتحان بہت کڑا تھا' وہ پورے اترے تو اللہ نے انہیں امامۃُ الناس کے منصبِ جلیلہ پر فائز فرمانے کا اعلان کر دیا --- یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں عظیم اقوام پیدا ہوں گی بلکہ آئندہ سلسلۂ نبوت و رسالت بھی انہی کی نسل میں جاری رہے گا ---- سورۃ البقرہ کے اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس اہتمام سے ذکر کرنے میں یہ مصلحت اور حکمت نظر آتی ہے کہ پچھلی آیات میں چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل کو اس منصب جلیلہ سے معزول کرنے کا ذکر تھا جس پر وہ گذشتہ دو ہزار سال سے فائز چلے آرہے تھے کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ صرف انہی کی نسل میں جاری تھا' اور دو رکوعوں کے بعد حضرت ابراہیمؑ ہی کی ایک دوسری شاخ یعنی بنو اسماعیل کو اس منصب پر فائز کرنے گویا ان کی تاجپوشی کا ذکر آنے والا ہے لہٰذا درمیان میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کر دیا کہ جن پر جا کر یہ دونوں سلسلے مل جاتے ہیں۔ گویا واضح فرمادیا گیا کہ اللہ کے فضل خصوصی کے حقدار تو بس وہی لوگ ہوں گے جو ملت ابراہیمی کی پیروی میں توحید کے پرچم کو بلند رکھیں گے!)

(کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا میری اولاد کو بھی امامۃ الناس کا منصب حاصل رہے گا' اللہ نے واضح فرمادیا کہ تمہاری اولاد میں سے جو لوگ تمہاری ملت پر قائم اور میری دی ہوئی شریعت و ہدایت پر کار بند رہیں گے وہ تو یقیناً اس امامت کے وارث ہوں گے لیکن جو لوگ راہ حق سے انحراف کر کے شیطان کی پیروی کریں گے ان کے لئے اس امامت میں سے کوئی حصہ نہ ہوگا!)

اسلام کا جہان نو کیسے پیدا ہو گا

اسلامی تحریکوں اور مغرب کا ٹکراؤ۔۔۔۔۔

مغربی دانشوروں کی سوچ کیا ہے؟

عبدالکریم عابد

مسلمان حکمراں حلقوں میں گھبراہٹ کیوں طاری ہوتی جارہی ہے!

ہیگل کا فلسفہ تھا کہ اس دنیا کا ارتقاء تصورات کی جنگ اضداد کے نتیجے میں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ہیگل کے مطابق پہلے ایک تصور روح عصر ہوتا ہے لیکن آگے چل کر اس کا مخالف تصور نمودار ہوتا ہے' دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں اور نیا نظریہ فتح یاب ہوتا ہے لیکن پرانے نظریہ کے اچھے اور ضروری اجزا کو اپنے میں جذب کرلیتا ہے۔ اس طرح انسانیت اور تاریخ آگے بڑھتی رہی ہے اور ایک روز اس جنگ اضداد کے نتیجے میں ہی انسانیت رتبہ کمال پر پہنچے گی۔

یہ فلسفہ مشرق ومغرب کی آویزش پر ابھی تک منطبق نہیں ہوا کیونکہ مشرق اب بھی مشرق ہے اور مغرب اب بھی مغرب ' دونوں کا ملاپ نہیں ہوا البتہ ملاپ نہ ہونے کے باوجود مغرب نے مشرق پر اپنا گہرا رنگ چڑھا دیا ہے۔ اس مغربی رنگ کے باوجود روح شرق نے ہار نہیں مانی اور اس دور میں مشرقی روح کا اظہار جدید اسلامی تحریکوں میں ہو رہا ہے۔

مغرب ان تحریکوں کو کچل دے گا یا یہ پرامن بقائے باہمی سیکھ لیں گے یا ایک دوسرے کے اثر وامتزاج سے ایک نئے مشرق اور نئے مغرب کو تخلیق کریں گے؟۔ اس بارے میں ابھی کچھ نہیں لکھا جا سکتا تاہم مغرب کے متعدد دانشوروں نے کافی عرصہ سے یہ کہنا شروع کر رکھا ہے کہ کمیونیزم سوشلزم کا خاتمہ ہو گیا' مگر اب مغرب کے لئے نیا خطرہ اسلام کا ہو گیا ہے۔ کیسنگر اور کمن دونوں نے سپر پاور روس کی موجودگی میں کہا تھا کہ روس اور امریکہ دونوں کو اسلام کے خطرے کے مقابلے کے لئے مل جانا چاہیے۔ حال ہی میں سنڈے ٹیلگراف میں جان کیسی نے لکھا ہے کہ اب جب کہ سرد جنگ کے عادی اعصاب کے لئے کوئی دشمن نہیں رہا ہے تو انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ دشمن اسلام کو بنا دینا چاہیے ۔ نیشنل ریویو آف امریکہ میں رچرڈ کونڈر نے گھبراہٹ طاری کرنے کے لئے نیا مضمون باندھا ہے جس کا عنوان ہے "مسلمان آ رہے ہیں"۔ امریکی رسالے ٹائم نے اسلامی خطرہ پر ٹائٹل سٹوری شائع کی ہے' اس ٹائٹل میں کلاشنکوف کو مسجد کے مینار سے بلند دکھایا گیا ہے۔ فرانس کے دانشور جین میری لی پین نے خطرے کی گھنٹی بجائی ہے کہ مسلمان تارکین وطن کی یلغار سے یورپ کہیں کا نہیں رہے گا۔

سنڈے ٹائمز کے اداریہ نگار نے بھی اسلامی خطرہ کا جائزہ لیا ہے۔ پیٹرک بچمان کو یقین ہے کہ اکیسویں صدی میں معرکہ صلیب و ہلال ضرور برپا ہو گا۔ پیٹر جینکسن اور ایم ایس لینڈ کا کہنا ہے کہ مسلمان اس بار ویانا میں روکے نہیں جاسکیں گے۔ جین پال سارتر پہلے ہی ایک ناول لکھ چکے ہیں' اس میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ یورپ پر جب مسلمان تارکین وطن چھا جائیں گے تو کیا ہو گا۔ فرانسیسی مورخ لبنان نے اس صدی کے اوائل میں پیش گوئی کی تھی کہ مسلمان اور ایشائی ملکوں کی آبادی تلاش روزگار میں مغرب پہنچے گی اور یہ مغرب میں اہل مغرب کو بے بس کر دیگی۔ ایک

اور دانشور نے اس کا ماتم کیا ہے کہ اوسطاً ہر مسلمان چھ بچے پیدا کرتا ہے جبکہ عیسائی دنیا کی شرح پیدائش کا اوسط ۱.۷ ہے۔ اس وقت بھی ۳۲ مسلمان ملکوں میں ۸۵ فی صد آبادی مسلمان ہے اور یہ پھیلتے چلے جا رہے ہیں' خاندانی منصوبہ بندی کو مانتے ہی نہیں۔

مغرب کے نقطۂ نظر سے مسلمان آبادی تو خطرہ ہے ہی لیکن مسلمانوں کی نئی اسلامی سوچ مزید تشویش انگیز ہے۔ اسلام کو خطرہ بنا کر پیش کرنے میں عالمی سرمایہ داری اور صیہونیت کے گماشتوں کا بڑا دخل ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آگے چل کر امریکہ اور یورپ کے درمیان نئی صف بندی ہونے والی ہے۔ صیہونی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں اور یورپ کے درمیان قدیم مذہبی تعصب نہ صرف زندہ رہے بلکہ اس کا احیا ہو اور اس معرکہ صلیب و ہلال کو صیہونیت اور اس کو امریکہ اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر سکے۔

اس وقت اسلامی تحریکوں کے بارے میں امریکی یورپی ذرائع ابلاغ میں بہت سی باتیں کہی جا رہی ہیں' ان کا بہ غور جائزہ لینے اور ان کے مضمرات و مقتضیات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مغرب کا ایک نقطۂ نظر تو وہ ہے جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا کہ اسلامی خطرہ کا شور مچاؤ' دوسرا نیا نقطۂ نظر حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ اس کی نمائندگی امریکہ کے مڈل ایسٹ واچ کے ادارہ نے بھی کی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق امریکہ عالم اسلام میں اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں جن حکومتوں کی حمایت کر رہا ہے وہ بدترین آمریتیں ہیں یا شخصی حکمرانی کے نظام ہیں اور ان آمریتوں میں بہت بدعنوانی ہے۔ امریکہ کو ان کی حمایت سے دستکش ہو جانا چاہیے اور اسلامی تحریکوں میں ایسے اعتدال پسند عناصر کو اپنانا چاہئے جو ان کی جگہ لے سکتے ہوں ورنہ اس وقت عالم اسلام میں جو امریکی گورے ہیں' وہ سب بھگوڑے ثابت ہونگے۔ عوام کے ریلے کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہیں اور اب سوشلزم بھی مٹ مٹا گیا' لسانی نیشنلزم کے ہنگامے منفی ہیں' تخریب کے بعد تعمیر نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی مثبت قدر کی تحریک ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ اعتدال پسندوں کا اسلام اس لحاظ سے بہت بہتر ہے کہ یہ نیا سیاسی شعور عطا کرتا ہے' جمہوریت اور کثیر الجماعتی نظام کو مانتا ہے' بنیادی انسانی حقوق کو اسلام کی چیز بتاتا ہے' عوام میں تبدیلیوں کی امنگ اور خواہش کی ترجمانی کرتا ہے اور پرانے آمروں یا بادشاہوں یا شیوخ کی جگہ نئے لوگ لا سکتا ہے۔

اس دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق الجزائر' مصر' سوڈان' ایران' خلیجی ممالک' پاکستان' انڈونیشیا اور ملائشیا غرض ہر جگہ اسلامی تحریکیں آگے بڑھ رہی ہیں اور پرانے حکمرانوں کے بس میں نہ انہیں روکنا ہے نہ یہ ان کو اپنا سکتے ہیں اس لئے ان سب کی چھٹی کرا دینی چاہیے اور کریمن ڈیموکریٹس کی طرح اسلامک ڈیموکریٹس کو آگے لانا چاہیے تاکہ ان اسلامی تحریکوں کو مغرب کے خلاف متشددانہ تخریب کاری اور دہشت گردی کے راستے سے ہٹایا اور بچایا جا سکے۔ اس نقطۂ نظر کی بنا پر سعودی عرب' کویت' تیونس' مراکش اور پاکستان ہر جگہ گھبراہٹ طاری ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟۔ لندن میں سعودی سفیر جناب عبدالرحمن غازی الفقیہی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ان اسلامی تحریکوں میں چالیس فی صد اسلام ہے' چالیس فی صد عوام میں تبدیلی کی خواہش ہے خواہ کیسی ہی تبدیلی ہو مگر ہو اور بیس فی صد اقتدار کے بھوکے ہیں جو ان تحریکوں کی قیادت کر رہے ہیں اور علاقہ میں عدم استحکام پیدا کر رہے ہیں۔ ہم نے خلیجی جنگ سے پہلے ان تحریکوں کی مالی مدد کی مگر اب پچھتا رہے ہیں کہ کیوں ان سانپوں کو پالا۔

ادھر حال ہی میں امریکہ میں تیونس کے سفیر نے نیویارک ٹائمز میں ایک خط شائع کرایا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ اسلامی تحریکوں کا اسلام "سیاسی اسلام" ہے اور جمہوریت کے لئے خطرہ ہے۔ لیکن سفیر موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ تیونس میں کون سی جمہوریت ہے جس کو اسلام مٹانا چاہتا ہے' وہاں تو فوجی حکومت ہے۔ یہی حال دیگر علاقوں کا ہے۔ مصر میں اب حکومت نے یہ کیا کہ صدر ناصر مرحوم کے حامیوں سے کہا ہے کہ آپ سیاسی جماعت بنا سکتے ہیں' بلکہ ان بنیاد پرستوں کے خلاف محاذ قائم کریں تو ہم آپ کو آئندہ الیکشن میں بھی حصہ لینے دیں گے جبکہ اخوان کے رہنماؤں نے مغربی اخبارات سے انٹرویو میں کہا ہے کہ جمہوریت کے علمبردار تو ہم ہیں' اس کے لئے جدوجہد ہماری ہے وہ تو نہ سیاسی جماعتوں کے قائل ہیں نہ الیکشن کے۔ پھر مغرب ہماری مخالفت اور ان کی حمایت کیوں کر رہا ہے؟۔ یہی سوال تیونس کی اسلامی تحریک کے رہنما راشد غنوشی نے بی بی سی کے انٹرویو نگار سے کیا کہ جناب یہ ہم سے کہ تیونس میں حقوق انسانی لیگ قائم کی اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ الجزائر کی اسلامی نجات پارٹی بھی مغرب سے یہی سوال پوچھ رہی ہے اور یہ سوال ایسا ہے کہ مغرب سر جھکا کر سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

اگست میں ہمارے ایک دوست پروفیسر ممتاز امریکہ سے پاکستان آئے۔ وہ پروفیسر خورشید کے ساتھیوں میں تھے' شاید اب بھی ہیں۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ امریکی یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتے ہیں اور امریکی پالیسی سازوں کو مشورے دیتے ہیں۔ انہوں نے سوڈان اور ملائشیا کی اسلامی تحریکوں کا جائزہ لینے کے لئے ان علاقوں کا تفصیلی دورہ کیا اور اہم لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ اپنی گفتگو میں انہوں نے مغرب اور اسلامی تحریکوں کے درمیان غلط فہمیوں اور رنجشوں کے خاتمے کو ممکن بتایا لیکن اس کے لئے امریکہ کو بھی نئی پالیسی کی ضرورت ہوگی اور اسلامی تحریک کو بھی مغرب کے متعلق معاندانہ انداز سے سوچنا ترک کرنا ہوگا۔ پروفیسر ممتاز نے بتایا کہ سوڈان کے حسن ترابی کا دورۂ امریکہ کامیاب رہا ہے۔ ان سے امریکیوں نے بہت کچھ سمجھا ہے اور بہت تاثر لیا ہے۔

یہ سب کچھ ابھی بہت ابتدائی اور خام صورت میں ہے۔ آگے چل کر امریکہ سیکولر عناصر کی بجائے اسلامی تحریکوں پر ہاتھ رکھے گا یا نہیں' اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ابھی امریکی انتخابات بھی ہونے ہیں تاہم یہ طے ہے کہ مشرق اور مغرب کی جنگ اضداد ضرور ہوگی اور مغرب نے مشرق پر جو اثر ڈالنا تھا وہ ڈال دیا' اب مشرق بھی اپنی اس تصوراتی قوت کا مظاہرہ کرے گا جو اس کے پاس اسلام کی شکل میں ہے اور افریقہ' مشرق وسطیٰ' جنوب مشرقی ایشیا اور وسطی ایشیا کے علاوہ امریکی اور یورپی شہروں میں اپنا علم بلند کر رہی ہے۔ یہ تحریک مغرب سے ٹکرا کر دم توڑ دیگی' آپس کے تفرقہ کا شکار ہو کر تحلیل ہو جائیگی' مغرب کے ہاتھ کا کھلونا بن جائیگی یا مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد ان کے امتزاج سے جہان نو پیدا ہوگا۔ یہ ایسے سوالات ہیں کہ ان کے جوابات کا مسلمانان عالم کے رویہ سے تعین ہوگا اور خدا کرے کہ یہ رویہ صحیح ہو تاکہ صحیح جواب حاصل ہو سکے۔ ○○

امید و بیم میں فاصلے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

پاکستان کے وجود اور مستقبل کی فکر کالم نگاری کا محرک بنی

ڈاکٹر اسرار احمد

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

گذشتہ چند ہفتوں سے جو مسلسل گفتگو ان کالموں میں چل رہی ہے ' آج اس سلسلے کو عارضی طور پر منقطع کر کے کچھ "درد دل" بیان کرنے کا ارادہ ہے ۔ وجہ اس کی یہ بنی کہ بعض احباب کی جانب سے یہ تنقید موصول ہوئی کہ تمہارے "کالم" روزنامے کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے ۔ یہ تو ایک مستقل سلسلہ مضامین ہے جس کا موضوع دقیق بھی ہے اور ثقیل بھی 'جبکہ روزناموں کے کالموں میں روزمرہ کے حالات و واقعات پر ہلکے پھلکے انداز میں بحث کی جاتی ہے ۔ میں اس تنقید یا اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نہ معروف معنی میں "صحافی" ہوں اور نہ ہی مروجہ مفہوم کے مطابق "کالم نگار" اور واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک سلسلہ مضامین ہے جس کے ذریعے میں ایک پیغام قوم کو دینا چاہتا ہوں ' اور جس کی اشاعت کے لئے میں ادارہ نوائے وقت کا ممنون ہوں' لیکن میرا دعویٰ ہے کہ ان کا موضوع پاکستان کے استحکام ہی نہیں' عین وجود ' اور اس کے مستقبل ہی نہیں ' حال کے لئے بھی نہایت فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے ۔ اور اگرچہ میری یہ حیثیت تو نہیں کہ علامہ اقبال کی طرح یہ احتجاج کر سکوں کہ ۔ "مرا یاراں غزلخوانے شمردند!" تاہم ---- یہ درخواست تو کر ہی سکتا ہوں کہ ۔ "مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ!"

امید و بیم کی کیفیت

میری ان تحریروں کا اصل محرک پاکستان کے وجود اور مستقبل کے بارے میں "امید و بیم" کی وہ کیفیت ہے جس سے میں عرصے سے دوچار ہوں' اور جس کی دو طرفہ شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے ساتھ بندہ کے تعلق میں بھی " بین الخوف والرجا" کی متوازن کیفیت تلقین فرمائی ہے ---- اور پاکستان کے وجود اور مستقبل کے بارے میں بھی یہ دوطرفہ کیفیت کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے ' لیکن خوف اور رجا کے مابین فاصلے اور امید اور بیم کی کیفیات کی شدت سب میں ایک جیسی نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ ان کے مابین بعد و فصل اور فرق و تفاوت جتنا زیادہ ہوگا متعلقہ شخص کے لئے معاملہ اتنا ہی زیادہ تکلیف دہ ہوگا------ اور چونکہ یہ کیفیت ادھر کچھ عرصے سے مجھ میں زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی ہے ' لہٰذا مجبوراً قلم ہاتھ میں لیا ہے تاکہ ابنائے وطن ' اور قوم کے خواص و عوام کو اس درد میں شریک کرنے کی کوشش کروں۔

پاکستان ------ مرکز امید

پاکستان کے بارے میں ایک جانب میری امید اور "رجا" کی شدت کا عالم یہ ہے کہ میرے نزدیک اسلام کی نشاۃ ثانیہ ' خلافت علی منہاج النبوۃ کے دور ثانی' اور اسلام کے عالمی غلبے کے عمل کا نقطہ آغاز اسی خطہ ارض سے ہوگا۔ اور دوسری طرف یہ خوف اور اندیشہ بھی ۔ "عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں ۔ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اٹھا!" کے مصداق سوہان روح بنا ہوا ہے کہ شاید عذاب الٰہی کا' آخری اور فیصلہ کن کوڑا ہماری پیٹھ پر برسا ہی چاہتا ہے ۔ اور خاکم بدہن "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!" کا مرحلہ زیادہ دور نہیں رہا! اعاذنا اللہ من ذالک!!

الحمد للہ کہ جہاں تک میری امید کا تعلق ہے وہ ہرگز نہ وہمی ہے نہ خیالی ' بلکہ اس کی اساس ایک جانب گذشتہ چار صدیوں کے ٹھوس تاریخی حقائق و واقعات پر قائم ہے تو دوسری جانب مستقبل کے بارے میں قرآن کے صریح اشاروں اور "الصادق و المصدوق" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح پیشینگوئیوں پر مبنی ہے ۔

غلبہ دین حق ہو کر رہنا ہے

قرآن حکیم نے تین مقامات پر یعنی سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳' سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصف کی آیت ۹ میں واضح ترین الفاظ میں اعلان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد "غلبہ دین حق" ہے ---- دوسری جانب سورۃ اسبا کی آیت ۲۸ اور سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کی بعثت پوری نوع انسانی اور تمام عالم انسانیت کے لئے ہے ---- اور اس صغریٰ کبریٰ کا لازمی منطقی نتیجہ یہ ہے کہ آپؐ کا لایا ہوا دین پورے کرۂ ارضی اور تمام عالم انسانیت پر غالب و قائم ہو کر رہے گا!

چنانچہ اسی کی صریح پیشینگوئیاں متعدد احادیث کی رو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں ۔ مثلاً مسند احمد ابن حنبلؒ میں حضرت مقداد ابن الاسودؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے ارشاد

فرمایا: "روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا' نہ اونٹ کے بالوں کے کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ ' جس میں اللہ کا دین داخل نہ ہوجائے ' خواہ کسی صاحب عزت کے اعزاز کے ساتھ ' خواہ کسی کمزور کی زبردستی کی صورت میں ' یعنی یا تو گھر یا خیمے والا اسلام قبول کرلے گا' یا کم از کم اسلام کی بالادستی کو تسلیم کر کے زیردست ہونا قبول کر لے گا!" اسی طرح صحیح مسلمؒ کی روایت کے مطابق جو حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا: "اللہ نے میرے لئے پوری زمین کو لپیٹ یا سکیڑ دیا ۔ چنانچہ میں نے اس کے تمام مشرق اور تمام مغرب دیکھ لئے ---- اور سن رکھو کہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے سکیڑ کر یا لپیٹ کر دکھائے گئے!"

نقطہ آغاز یہی ملک ہوگا

قرآن حکیم کے ان اشارات اور نبی اکرمؐ کی ان تصریحات کے ساتھ اس ناگزیر اور اٹل حقیقت کو سامنے رکھ کر کہ اس عالمی غلبہ اسلام کا آغاز لا محالہ کسی ایک علاقے یا ملک ہی سے ہوگا۔ دنیا کے زمینی اور انسانی جغرافیے پر نظر ڈالئے اور سوچئے کہ وہ خوش قسمت خطہ ارضی کونسا ہوسکتا ہے اور وہ خوش نصیب قوم کونسی ہو سکتی ہے تو گذشتہ چار سو سال کی تاریخ یہ گواہی دیتی نظر آئے گی کہ اس کے دوران تائید ایزدی سے جتنی تجدیدی مساعی برپا ہوئیں اور مشیت خداوندی کے تحت جتنے اعاظم رجال یا مجددین ملت پیدا ہوئے ان سب کا تعلق اسی خطہ ارضی سے ہے جسے دنیا صنم خانہ ہند کے نام سے جانتی ہے اور جس کی جملہ دینی و مذہبی ' تہذیبی و ثقافتی ' اور علمی و فکری وراثت کی امین یہ سرزمین ہے جو پاکستان کے نام سے موسوم ہے ! مزید برآں' پورے کرہ ارضی پر یہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا ' اور جس کا وجود میں آنا حقائق و واقعات اور سیاست و عمرانیات کے جملہ اصولوں کے اعتبار سے خالص "معجزانہ" ہے تو پھر کیسے شک کیا جاسکتا ہے اس امر میں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ اور عالمی نظام خلافت کے قیام اور غلبہ دین حق کے عمل کا نقطہ آغاز یہی سرزمین بنے گی ۔ گویا " میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے " الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ : " میرا وطن وہی ہے ' میرا وطن وہی ہے!"

اندیشہ کی حدت بھی کم المناک نہیں

ایک جانب میری رجا اور امید کا عالم اتنا فرحت آمیز اور مسرت انگیز ہے ' تو دوسری جانب خوف کی شدت اور اندیشہ کی حدت کی کیفیت بھی اتنی ہی المناک اور درد انگیز ہے ۔ اور وہ بھی خیالی یا وہمی نہیں ٹھوس زمینی حقائق اور ناقابل تردید شواہد کے ساتھ ساتھ قرآن میں بیان شدہ اٹل قانون قدرت اور ناقابل تغیر سنت الٰہی پر مبنی ہے! چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ میں وارد شدہ اس قانون قدرت اور سنت خداوندی کے تصور سے مجھ پر لرزہ طاری ہوتا ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ سے کوئی وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کرے تو اللہ اسے اخروی سزا سے قبل اس دنیا ہی میں یہ نقد سزا دے دیتا ہے کہ لوگوں کے قلوب میں نفاق کے بیج بو دیتا ہے جو اس دن تک برگ و بار لاتے رہیں گے جس دن ان کی اللہ سے ملاقات ہوگی !---- اس لئے کہ اس اٹل قانون خداوندی اور سنت الٰہی کا یہ عملی مظہر میری نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ ہم نے من حیث القوم جو وعدہ اللہ سے کیا تھا کہ اگر ہمیں انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی سے نجات مل جائے ' اور ایک آزاد ملک عطا ہوجائے تو ہم اسے تیرے دین کا گہوارہ ' اور نوع انسانی کے لئے تیری ہدایت کا مینار بنا دیں گے ' اس کی مسلسل خلاف ورزی کا نتیجہ اس دوہرے نفاق کی صورت میں ہم پر بالفعل مسلط ہے کہ ایک جانب اخلاق کا جنازہ نکل چکا ہے ' اور قوم بحیثیت مجموعی حدیث نبویؐ کے الفاظ : " جب بولے جھوٹ بولے ' جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے ' اور جب امین بنایا جائے خیانت کرے" کا مکمل نمونہ بن چکی ہے ' ---- تو دوسری طرف نفاق باہمی کا یہ منظر نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ وہ قوم جو نصف صدی قبل مسلم قومیت کے جذبے سے سرشار ہو کر اور ایک پلیٹ فارم پر ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر "امت واحدہ " بن گئی تھی ' آج نسلی ' لسانی اور علاقائی قومیتوں میں تحلیل اور منقسم ہو کر " من دیگرم تو دیگری" کے راگ الاپ رہی ہے ---- اور دنیا تماشا دیکھ رہی ہے کہ کرہ ارض پر اسلام کے نام پر وجود میں آنے والا واحد ملک کن ناگفتہ بہ حالات اور کیفیات سے دوچار ہے --- اور دشمن نہ صرف یہ کہ فقرے چست کر رہے ہیں کہ: " پاکستان تا حال اپنے تشخص کی تلاش میں سرگرداں ہے !" بلکہ خوشی اور مسرت سے سرشار ہو کر پیشینگوئی کر رہے ہیں کہ :" پاکستان حصے بخرے ہونے کے انجام (بلقانائزیشن) کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے!"

ہم پل صراط سے گزر رہے ہیں

اس پر مستزاد دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش کی صورت اختیار کرلینے کے المناک حادثہ کی صورت میں عذاب الٰہی کا جو کوڑا ہماری پیٹھ پر پڑا تھا اس کے پس منظر میں جب سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ میں وارد شدہ قانون الٰہی کہ "ہم لازماً مزہ چکھائیں گے انہیں چھوٹے عذاب کا ' بڑے عذاب سے قبل ' شاید کہ یہ لوٹ آئیں !" ذہن کے سامنے آتا ہے تو لرزہ طاری ہوتا ہے کہ کہیں قیام پاکستان کے چوبیس برس بعد نازل ہونے والا یہ عذاب بھی کسی بڑے عذاب کی تمہید نہ ثابت ہو ' اور اب جبکہ مزید چوبیس برس پورے ہونے میں صرف تین برس باقی رہ گئے ہیں کہیں وہ عذاب استیصال قریب تو نہیں آگیا جس کی تعبیر قرآن میں کبھی تو یوں کی جاتی ہے کہ :" ایسے ہوگئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں !" اور کبھی ان الفاظ سے کی جاتی ہے کہ "ظالم قوم کی جڑ کاٹ ڈالی گئی!" --- اس لئے کہ اس حقیقت کو جھٹلانا ہرگز ممکن نہیں کہ ۱۷ء کے المناک حادثہ فاجعہ کے نتیجے میں "ہوش میں آنے" یا اللہ کی جناب میں توبہ اور رجوع کرنے کی کوئی کیفیت ہمارے اندر کم از کم قومی اور اجتماعی سطح پر ہرگز پیدا نہیں ہوئی ۔ تو کیا "عذاب اکبر" کا خوف اور خدشہ صرف خیالی اور وہمی ہے؟ الغرض ۔

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی ' کبھی پیچ و تاب رازی

کے مصداق ایک جانب اس انتہائی امید اور رجا ' اور دوسری جانب اس حد درجہ مایوسی اور ناامیدی کے مابین مجھے پاکستان ہر لحظہ ایک پل صراط پر سے گذرتا نظر آتا ہے جس نے کامیابی سے گذر گیا تو اسلام کی تجدید اور احیاء کے ساتھ ساتھ دنیوی عزت اور سربلندی ' اور سب سے بڑھ کر عالمی غلبہ اسلام کے نقطہ آغاز بننے کی سعادت سے ہمکنار ہوجائے گا ۔ اور اگر قدم ڈگمگا گئے تو نہ صرف یہ کہ قعر ذلت میں گر جائے گا' بلکہ کیا عجب کہ اس کے کئی ٹکڑے ہوجائیں اور سابق سوویت یونین کی

طرح پاکستان کا نام بھی دنیا کے نقشے سے حرف غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے ! فاعتبروا یا اولی الابصار!!

پاکستان کا اصل مسئلہ

ان حالات میں مجھے تو پاکستان کا "روز مرہ" ہی کا نہیں ' ہر لمحہ اور ہر لحظہ کا "اصل مسئلہ" یہی نظر آتا ہے کہ یہ سلطنت خدا داد ۔ "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق اپنے اصل مقصد قیام کی جانب مراجعت کرے ۔ اس لئے کہ میرے نزدیک پاکستان کے جملہ مسائل اور تمام مشکلات کا واحد حل اسی ایک مسئلے میں مضمر ہے کہ یہاں اسلام عملاً قائم ہو!

ہونا کیا چاہیے؟

البتہ "اسلام کے قیام" کے بارے میں بھی میں حسب ذیل آراء پر علیٰ وجہ البصیرت قائم ہوں ۔ (جن میں سے بعض کے بارے میں کسی قدر تفصیلی گفتگو گذشتہ چند ہفتوں کے دوران ان کالموں میں ہو چکی ہے)۔

۱) "اسلام کے قیام" سے اصل مراد اور مطلوب صرف عقائد کی تصحیح اور عبادات اور انفرادی نیکی کا فروغ یا چند حدود و تعزیرات کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اسلام کے "نظام عدل اجتماعی" کا قیام ہے۔

۲) یہ عظیم مقصد صرف تعلیم و تربیت ' وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو نہ قرآن میں جہاد اور قتال کا تذکرہ تک ہوتا ' نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنا خون بہانے اور اپنے بہترین اور عزیز ترین ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی کوئی ضرورت پیش آتی۔ اس لئے کہ آپؐ سے بڑا داعی و مبلغ ' اور معلم و مزکی نہ آپؐ سے قبل کوئی ہوا نہ آئندہ کبھی ہو سکتا ہے ۔

۳) اسی طرح یہ مقصد عظیم انتخابی سیاست ' اور کشاکش اقتدار (پاور پالیٹکس) میں شریک ہو کر بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔ اس لئے بھی کہ انتخابات بنیادی طور پر کسی قائم نظام کو چلانے کے لئے ہوتے ہیں ' گویا ان کا فطری تقاضا "Status Quo" کو برقرار رکھنا ہوتا ہے ' نہ کہ کوئی بنیادی تبدیلی لانا۔ اور اس لئے بھی کہ بالفعل کسی بھی معاشرے میں ووٹروں کی عظیم اکثریت ان لوگوں کے چنگل میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے جن کو موجود الوقت Politico Socio Economic System میں مراعات و مفادات حاصل ہوتے ہیں ۔ لہٰذا انتخابات خواہ کتنے ہی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ کیوں نہ ہوں ' ان کے ذریعے صرف ہاتھ یا چہرے تو بدل سکتے ہیں ' یا اس سے بھی ادنیٰ درجہ میں پیشانیوں کے لیبل تبدیل کرائے جاسکتے ہیں ' سماجی و اقتصادی نظام میں کوئی بنیادی (ریڈیکل) تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔

۴) بنا بریں پاکستان میں اسلام کا قیام ' یا بالفاظ دیگر اس کے نظام عدل اجتماعی کا نفاذ ' ایک بھرپور اور گمبھیر انقلابی جدوجہد کا متقاضی ہے ' جس کے لوازم و شرائط ' اور مدارج و مراحل کے فہم و شعور کا واحد منبع اور سرچشمہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ لہٰذا لازم ہے کہ پوری توجہ کو "منہج انقلاب نبویؐ" پر مرکوز کر کے پہلے خالص معروضی انداز میں سمجھا جائے کہ اب سے چودہ سو سال قبل آپؐ نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین اور ہر اعتبار سے صحیح العقول انقلاب کس طرح برپا کیا تھا ' اور پھر واضح طور پر متعین کیا جائے کہ موجودہ حالات میں اس وقت کے مقابلے میں کن کن پہلوؤں سے کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں اور ان کی بنا پر آپؐ کے منہاج انقلاب میں کن معین اجتہادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

۵) پھر جو لوگ اور جو ادارے مختلف تعلیمی ' تبلیغی یا اصلاحی کاموں میں مصروف ہیں ان کے لئے تو اتنا بھی کافی ہوگا کہ وہ اپنے ان تمام کاموں کو جاری رکھتے ہوئے صرف ان کے رخ کو انقلاب کی جانب موڑ کر ' گویا انہیں " <Revolution_Oriented بنا کر ' انقلابی عمل سے ہم آہنگ کردیں ۔ لیکن جو قوتیں پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ اسلامی نظام کے قیام کے مقصد ہی کے لئے ملک کی انتخابی سیاست میں شریک ہیں ان کو تو نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے طریق کار پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور یہ طے کرنا ہوگا کہ انتخابی سیاست سے یکسر کنارہ کش ہو کر اپنی پوری جدوجہد اور جملہ مساعی کو انقلاب کے لئے وقف کردیں اور اگرچہ " منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!" کے مصداق جماعتوں اور تحریکوں کے لئے طریق کار کی اتنی بنیادی تبدیلی بہت مشکل ہوتی ہے ' تاہم میں گذشتہ چار صدیوں کے تاریخی شواہد ' اور جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کی بناء پر قیام پاکستان کے مانند اس "معجزہ" کے ظہور سے بھی نا امید نہیں ہوں۔

اور مقصد کے حصول کی ادنیٰ سی کوشش کے طور پر میں " منہج انقلاب نبویؐ" کے مطالعہ و تجزیہ پر مشتمل یہ سلسلہ مضامین مسلمانان پاکستان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف! ○○

سرب سورماؤں کی جنگی لوٹ مار پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے ۔ مغربی اقوام میں جاری بحث و مباحثہ اور مسلمان حکمرانوں کا اظہار اطمینان ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں کہ بوسنیا کے مسلمانوں کی مدد کے لئے کچھ نہ کچھ کیا جارہا ہے کیونکہ سربیا یہ جنگ پہلے ہی جیت چکا ہے ۔ سرب راہنما سلو بودان ملوسوچ' کی حکومت سابقہ یوگو سلاویہ کے آر پار ایک ایسی پٹی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جو نسلی اعتبار سے بالکل "پاک و صاف" کی جاچکی ہے ۔

سرب قاتلوں کی طرف سے بوسنیا کے مسلمانوں کی اس وحشیانہ نسل کشی کے دوران پورے کے پورے قصبے تہس نہس کردئے گئے اور لاکھوں بے گناہ مسلمان شہری گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوئے "عظیم تر سربیا" کے مکروہ خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے بلغراد سے بہک تک دو سو میل چوڑا علاقہ " صاف" کیا جاچکا ہے ۔ گزشتہ ہفتے بوسنیا میں خود ساختہ " سرب جمہوریہ" کی اسمبلی ایک بار پھر قرار داد پاس کر کے جنگی جرائم کو قانونی جواز دے چکی ہے ۔ " جمہوریہ" کے صدر رودان کرزک کا کہنا تھا کہ آزادی ایک دفعہ حاصل ہوجائے تو اس کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ کسی قیمتی ہیرے سے کم نہیں جسے کوئی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دے گا"۔ اور ان کا یہ کہنا غلط بھی نہیں ۔ کسی نے بھی سنجیدگی سے سرب جارحیت کا نوٹس نہیں لیا ۔ سرب عیسائیوں کی وحشت و بربریت پر عالمی ضمیر خاموش نہ رہ سکا تو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے پچھلے ہفتے ایک قرار داد پاس کردی ہے جس کے ذریعے بوسنیا میں انسانی ہمدردی کے تحت بھیجی جانے والی امداد کے سلسلے میں طاقت استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے مگر یہ طے کئے بغیر کہ امدادی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے یا کون سے ممالک یہ طاقت فراہم کریں گے ۔ سربیا کی جانب سے کی جانے والی چڑھائی کو روکنے کا سرے سے کہیں ذکر نہیں ۔ ایک دوسری قرار داد میں نسل کشی کی مذمت کی گئی ہے ' لیکن جنگی جرائم کی تفتیش کے لئے کسی ٹریبونل کے قیام کی کوئی بات نہیں ۔

جمہوریت اب اسلام کے مقابلے میں ایک دین ہے' دینِ کفر

خلافت کے ساتھ جمہوریت کی "پیوند کاری"

سیاستِ خلافت کے دوسرے مذاکرے میں پڑھا جانیوالا ایک مقالہ

چودھری مظفر حسین

گزشتہ شمارے میں ہم نے اس مذاکرے کی مختصر روداد شائع کی جو پچھلے جمعہ کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں "سیاست خلافت" کے موضوع پر ہونے والی دوسری تقریب تھی۔ ہمارے ساتھی ریاض الحق صاحب نے صدر مجلس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اختتامی کلمات کی رپورٹ میں لکھا کہ انہوں نے جنرل رپٹائرڈ ایم ایچ انصاری کے سوا سب فاضل مقررین سے یہ شکوہ کیا تھا کہ موضوع بحث سے انصاف نہیں کیا گیا۔ چودھری مظفر حسین کے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ اقبال حاکمیت جمہور کے سب سے بڑے مخالف لیکن خلافت جمہوریت کے علمبردار تھے اور یہ فرق شاید چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس پر ہمارے قابل احترام چودھری صاحب نے احتجاج کیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ ان کا مقالہ "ندائے خلافت" میں من و عن شائع کیا جائے اور پھر یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جائے کہ چودھری صاحب نے اقبال کو سمجھنے میں غلطی کی یا خود ڈاکٹر صاحب سے چودھری صاحب کی بات سمجھنے میں کوتاہی ہوئی ہے۔ چنانچہ اب آپ ہی انصاف کیجئے۔ ہمارے لئے دونوں ہی محترم ہیں' بایں ہمہ اتنی شکایت ہمیں بھی ہے کہ چودھری صاحب نے خلافت کے سیاسی و دستوری ڈھانچے کے دس نکات میں سے صرف ایک پر بات کی اور اس کا بھی کوئی متبادل پیش نہیں کیا۔ اگر وہ یہ بتاتے کہ دور حاضر کے نظام خلافت میں ان اصولوں کا متبادل کیا ہوگا جو جمہوریت سے مستعار لئے جاسکتے ہیں تو کم از کم اسی پہلو پر بات مکمل ہوجاتی اور تشنگی نہ رہتی ---- مدیر

سلسلہ گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے میں یہاں ایک قصہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے والد مرحوم نے مجھ سے روائت کیا تھا۔ روائت کے مطابق میاں شیر محمد شرقپوری رحمتہ اللہ علیہ ایک بار اپنے خالہ زاد بھائی سر محمد شفیع سے ملنے گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد سر محمد شفیع نے سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے میاں صاحب علیہ الرحمتہ سے پوچھا "بھائی جان کوئی نئی تازہ خبر؟" تو میاں صاحب نے ترش لہجے میں فرمایا "اوئے انھیاں تینوں قرآن دیاں خبراں چودہ سو سال پرانیاں لگن لگ پیاں نیں' تے میرے کولوں نویاں خبراں پچھدا ایں۔" (او اندھے! تجھے قرآن کی خبریں چودہ سو سال پرانی لگ رہی ہیں کہ مجھ سے نئی خبریں پوچھ رہے ہو) سر میاں محمد شفیع کا سوال ایک سیاستدان کا سوال تھا۔ جس پر اس کا ایک ہم عصر ولی اللہ اپنے مخصوص صوفیانہ اسلوب میں اسے تلقین کر رہا تھا کہ وہ اپنے اندر سیاسی بصیرت پیدا کرنے کے لئے قرآن حکیم کی طرف کیوں رجوع نہیں کرتا۔

ہر دور میں اہل ذکر اپنی حرارت ایمان اور اہل خبر اپنے نور ایمان سے قرآن حکیم سے ایسے بصیرت افروز افکار اخذ کرتے ہیں جو اپنی الہامی نوعیت کے اعتبار سے ازلی وابدی لیکن احوال زمانی ومکانی پر اطلاق کے لحاظ سے تازہ ترین خبر بن جاتے ہیں۔ انہی افکار کی روشنی میں قوم رہنمائی پاتی ہے اور امت مسلمہ کا جہان تازہ منصہ شہود پر آتا ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ موجودہ سیاسی حالات میں وہ یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال' مولانا مودودی اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی فکر کے وارث ہیں اور پوری دلجمعی سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ان بزرگان ملت کے اٹھ جانے کے بعد وہ علمی اور فکری روائت قائم رہے جو قیام پاکستان کا سبب بنی اور حق تو یہ ہے کہ اس روائت کے قائم رہنے سے ہی پاکستان کا مستقبل وابستہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ملک میں علم و حکمت کا یہ چشمہ خشک نہ ہونے پائے۔ ذرا سوچئے تو کہ ڈاکٹر اقبال' مولانا مودودی اور ڈاکٹر رفیع الدین کے اٹھ جانے کے بعد پاکستان کیا پورے عالم اسلام میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جس کی طرف مشکلات کے گرداب میں گھری ہوئی یہ قوم فسئلو اہل الذکر اور فسئل بہ خبیرا کے قرآنی ارشاد کے مصداق رجوع کر سکے؟۔ قحط الرجال کے اس دور میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا وجود پاکستان کے لئے بسا غنیمت ہے اور جوں جوں ڈاکٹر صاحب ارذل العمر کی طرف بڑھ رہے ہیں ہماری پریشانیوں میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ کوئی دوسرا ڈاکٹر اسرار احمد ان کی جگہ لیتا نظر نہیں آتا۔ بہرحال یہ ہماری انسانی سوچ ہے' اللہ تعالیٰ جس سے چاہے' جتنا چاہے اپنے دین کی خدمت کا کام لے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد محض ایک علمی شخصیت ہی نہیں بلکہ عملی سیاست کے شناور بھی ہیں۔ انہوں نے بھرپور سیاسی زندگی گزاری ہے۔ اپنے سیاسی سفر میں وہ مسلم لیگ' جماعت اسلامی' خدام القرآن' دعوت انقلاب اور تنظیم اسلامی کے سنگ ہائے میل طے کرتے کرتے بالآخر تحریک خلافت پاکستان تک آپہنچے ہیں۔ کچھ عرصہ سے آپ نے روزنامہ نوائے وقت میں تفکر و تذکر کے عنوان سے اپنا ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا ہے اور ان مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو اس وقت ملک اور قوم کو درپیش ہیں۔ ان کی تحریروں سے فکری جمود ٹوٹا ہے۔ لوگوں میں غور و فکر کی تحریک پیدا ہوئی ہے۔ اس پرآشوب دور میں جبکہ پوری قوم مایوسیوں کے اندھیاروں میں بھٹک رہی ہے' کہیں سے روشنی کی کرن پھوٹے تو لوگوں کو بڑا حوصلہ ملتا ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قرآن و سنت کے گہرے مطالعے اور اپنے طویل سیاسی تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام انقلاب کے ذریعے آتا ہے' انتخابات کے ذریعے نہیں' اس میں کوئی شک نہیں ۔ پاکستان میں نفاذ اسلام کیلئے انتخابی سیاست کے طریقے سب کے سب بیکار ثابت ہوئے ہی ہیں اور اس پر مستزاد یہ ستم بھی ہوا ہے کہ خالص سیکولر مقاصد کے لئے بھی ہمارے ہاں جمہوریت کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ جمہوریت کے موجودہ طور طریقے دیکھ کر تو لوگوں کی مایوسی اور بیزاری اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جب "خلافت" کے متروک لفظ کو اپنی سیاسی لغت میں از سر نو رواج دیا تو لوگوں کو اس میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ خیال یہ تھا کہ وہ خلافت کی اصطلاح کو جمہوریت کے نعم البدل کے طور پر اپنائیں گے۔

لیکن ہوا یہ ہے کہ وہ جمہوریت کو "نوع انسانی کی مشترک میراث" اور "نور مصطفیٰ سے مستعار" سمجھتے ہوئے خلافت کو بھی "دور حاضر کے اعلیٰ ترین معیارات کی حامل ریاست" قرار دے رہے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ جمہوریت کے شجر پر "قرآن اور دور خلافت راشدہ سے بنیادی اصولوں کی پیوند کاری سے خلافت اور اصلاح سیاست کا سارا کام بہ آسانی ہو جائے گا۔ میری ناچیز رائے میں یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ پیوند کاری کے لفظ کی مناسبت سے اگر زراعت کی اصطلاح میں بات کروں تو میں یوں کہوں گا کہ اسلام کے سائن (SCION) کے لئے جمہوریت کا روٹ سٹاک (Root Stock) ہرگز سازگار نہیں' اور اس قسم کی پیوند کاری سے کوئی کونپل نہیں پھوٹ سکتی کیونکہ جمہوریت کا سیاسی تصور اکثریت کے جس اصول پر قائم ہے' قرآن حکیم اسے صریحاً "ضلالت" قرار دیتا ہے وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ۔ آیت کریمہ واشگاف الفاظ میں اکثریت کے اصول کی قطعی نفی کرتی ہے۔ اسکے علاوہ بھی قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اکثریت کے مقابلے میں راست رو صالحین کی اقلیت کو اسلامی اقدار کا حامل اور پاسدار قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جمہوریت کے سحر سے نہیں نکل سکے۔ وہ فرماتے ہیں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ سیاسی اور تمدنی ارتقا کے حوالے سے مغرب کے جمہوری تجربے اسلامی اصولوں کے منافی نہیں ہیں کیونکہ مغرب کے انہی تجربات کے ذریعے دنیا میں "انسانی حقوق" کا وہ تصور دوبارہ پیدا ہوا جو مسلمانوں میں ملوکیت کے رواج کے بعد دنیا سے ناپید ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے یہ ارشادات علامہ اقبال کے ان خیالات کی صدائے بازگشت ہیں جو انہوں نے ۱۹۰۹ء میں اپنے ایک مقالے میں پیش کئے تھے۔ میں یہاں اس سے چند اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

Democracy has been the great mission of England in modern times and the English statesmen have boldly carried this principle to countries which have been for centuries groaning under the most atrocious forms of despotism.

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

Authority, except as an interpreter of the law, has no place in the social structure of Islam. Islam has a horror of personal authority. We regard it as inimical to the unfoldment of human authority.

بلکہ اپنے اس مقالہ میں تو جمہوریت کی مدح سرائی میں علامہ اقبال اس حد تک آگے نکل گئے کہ وہ سلطنت برطانیہ کے دوام میں دلچسپی لینے لگے تاکہ اس کی بدولت انسانیت کا ارتقا صحیح رخ پر جاری رکھا جا سکے۔

The permanence of British empire as a civilizing factor in the political evolution of mankind is one of our great interests. This vast empire has our fullest sympathy and respect, since it is our own political ideal that is being slowly worked out in it.

مگر یہاں ہمیں دو باتوں کو ہرگز نہیں بھولنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ علامہ اقبال کے یہ خیالات ۱۹۰۹ء کے ہیں اور دوسرے یہ کہ جمہوری اداروں پر علامہ اقبال کی تنقید بھی نہائت ہی شدید اور سخت ہے مثلاً۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
اور تو سمجھا کہ آزادی کی ہے نیلم پری

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دوصد خر فکر انسانے نمی آید

لہٰذا علامہ اقبال کے افکار کا پوری طرح احاطہ کئے بغیر جمہوریت کے بارے میں انکا اصل موقف معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے لیکچرز میں علامہ اقبال نے جس Spritual democracy کی آرزو کی ہے وہ ہرگز اتنی سہل یاب نہیں ہے کہ موجودہ دور کے جمہوری اداروں پر محض چند قرآنی اصولوں کی پیوند کاری سے اسے معرض وجود میں لایا جا سکے۔ یہ موضوع گہری تحقیقات کا محتاج ہے اور سرسری مطالعہ سے کسی نتیجے پر پہنچ جانا صحیح نہیں ہو گا۔

ہمیں جان لینا چاہیے کہ جمہوریت کے مفہوم میں ۱۹۰۹ء کے بعد اتنی تبدیلیاں آچکی ہیں کہ اب یہ صحیح معنوں میں اسلام کے بالمقابل دین کفر بن چکا ہے۔ میں یہاں نظریہ جمہوریت میں عہد بہ عہد ان تصوراتی تبدیلیوں کا ذکر کروں گا جن کی وجہ جمہوریت بتدریج دین کفر میں تبدیل ہوئی۔ علامہ اقبال جس زمانے میں جمہوریت کی تعریف میں رطب للسان تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ جمہوریت کے مفہوم میں مذہبی اور اخلاقی اقدار بھی سموئی ہوئی تھیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ ۱۹۲۶ء میں مشہور امریکی مفکر اور دانشور ٹی وی سمتھ کا ایک مختصر سا مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوا جسے جمہوریت کی بائبل کہا جاتا تھا۔ اس کا عنوان تھا 'The Democratic Way of life' جملہ معترضہ کے طور پر یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ ٹی وی سمتھ جس قد کاٹھ کے دانشور تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپان کو امریکہ کے ہاتھوں شکست ہوئی تو وہاں ایک امریکی ٹیم اس غرض سے بھیجی گئی کہ جاپانی قوم کو deculturise کر کے اپنے استعماری مقاصد کے مطابق acculturise کیا جا سکے۔ غرض اس بلند پایہ ماہر تعلیم اور دانشور نے اپنی محولہ بالا کتاب لکھی تو اس میں جمہوریت کو ایک باقاعدہ اخلاقی اور مذہبی فلسفہ کے طور پیش کیا گیا اور اس کا شمار جمہوریت کی بائبل کے طور پر ہونے لگا۔ اس کتاب میں جمہوریت کے پانچ نصب

العین گنوائے گئے ہیں جو یہ ہیں:-

1- Democracy as a state of mind
2- The Fraternity Motif
3- The Liberty Motif
4- The Equality Motif
5- Democracy as sportsmanship

ٹی وی سمتھ نے جمہوریت کے جن نصب العینوں کا ذکر کیا ہے وہ سب کے سب اخلاقی نوعیت کے ہیں جن کی نوعیت مذہبی اخلاقیات کی سی ہے۔ پھر بھی اس نصب العینی ضابطہ میں مذہبی چاشنی پیدا کرنے کے لئے مصنف دیباچے میں لکھتا ہے:-

Ideals are many in form, even if unitary in direction. None are more precious than the trinity of ideals which has become associated with our democratic way of life.

ان سطور میں توجہ طلب امر یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی طرح ٹی وی سمتھ نے بھی جمہوریت کے خالص اخلاقی اصولوں پر مبنی ہونے کے باوجود اس میں مذہبی عقائد کی پیوند کاری کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۹۲۶ء سے لیکر ۱۹۵۱ء تک اس کے کئی ایڈیشن چھپے لیکن ۱۹۵۱ء میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں اس کے ساتھ Eduardc Lindeman کا بھی ایک مقالہ شائع کیا گیا جس میں جمہوریت کے سات کلیے (Propositions) بھی بیان کئے گئے جو یہ ہیں:

1- Through Diversity Towards Unity
2- Ideals Can Never Be More Than Partially Realized
3- The Means Must Be Consonant with Ends
4- Conference Is A Democratic Art
5- Planning Is the Price of Democratic Survival
6- Democracy Implies Institutional Correlation
7- Democracy Is A Conscious Motive in Education

ان عنوانات سے ظاہر ہے کہ دوسرا مقالہ زیادہ تر جمہوریت کے پروگرام کے عملی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے اور اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ جمہوریت کی تشریح میں اب روحانی پہلوؤں پر ہی اکتفا نہیں کیا جا رہا بلکہ دنیاوی پہلو mundane پر بھی اتنا ہی زور دیا جا رہا ہے۔ دو مصنفوں کی اس مشترکہ تصنیف کے ۱۹۵۱ء سے لیکر ۱۹۶۱ء تک چھ ایڈیشن شائع ہوئے لیکن اس کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن دیکھنے میں نہیں آیا۔

۱۹۶۰ء میں مشہور امریکی سوشیالوجسٹ Daniel Bell کی معرکہ آرا تصنیف: "The End of Ideology" شائع ہوئی۔ اس کتاب کا موضوع بقول مصنف On the Exhaustion of Political Ideas in Fiftees تھا اور اس میں وہ لکھتا ہے کہ دور حاضر کی نظریاتی کشمکش میں تمام "لیفٹ" اور "رائٹ" آئیڈیالوجیز ختم ہو چکی ہیں البتہ جو سیاسی اصول باقی رہے ہیں یا ہمیشہ باقی رہیں گے وہ فقط یہی چار اصول ہیں۔

Free Speech
Free Press
The Right to Opposition and
Free Inquiry

ان سیاسی اصولوں میں کسی مذہبی اخلاقی ضابطے یا اصول کا ذکر تو کیا جھلک تک نہیں ملتی۔ یہ سیدھے سادے سیکولر اصول ہیں۔ گویا جمہوریت کا یہ نیا تصور جمہوریت کی مذہبی اخلاقی اصولوں سے مکمل طور پر کنارہ کشی کا اعلان تھا۔ کتاب کے نام کی مناسبت سے مصنف لفظ آئیڈیالوجی کی وضاحت بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ اصطلاح درحقیقت فرانسیسی مفکر Destut de Tracy نے اختراع کی تھی جس کا مطلب

"A way of discovering truth other than through faith and religion"

تھا۔ اسلئے یہ اصطلاح مغربی سیکولر ماحول میں بڑی کثرت سے استعمال ہونے لگی۔ مارکس کو اپنے مقاصد کے حوالے سے ہر اصطلاح خاص طور پر بہت پسند آئی اور آئیڈیالوجی کا لفظ اس کے ہاں اپنے نظریات کی وضاحت کے لئے ایک مخصوص مفہوم اختیار کر گیا۔ اسی مناسبت سے ڈینئل بیل نے اپنے دیباچے میں بھی لکھ دیا ہے کہ اس نے آئیڈیالوجی کا لفظ زیادہ تر left_wing thought ہی کے لئے استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ ڈینئل بیل نے اس کتاب میں ان تمام نظام ہائے افکار کا جائزہ لیا ہے جو ۱۹۳۰ء سے لیکر ۱۹۶۰ء تک دنیا پر چھائے رہے اس لئے ان میں نازی ازم ، فاشزم وغیرہ بھی زیر بحث لائے گئے ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ڈینئل بیل ان تمام آئیڈیالوجیز کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے خالص سیکولر جمہوریت کی بقا کا اعلان کرتا ہے۔

حال ہی میں ایک سرکردہ جاپانی نژاد امریکی مورخ فاکویاما Fakuyama نے عصری تاریخی واقعات کا جائزہ لینے کے بعد End of History کے نام سے کتاب لکھی ہے اور ایک طرح سے ڈینئل بیل کی بات کی تائید میں عصری تاریخی حقائق پیش کئے ہیں کہ دنیا میں ہر کہیں سوشلزم کو شکست اور جمہوریت کو فتح حاصل ہو رہی ہے۔ جمہوریت کی بالادستی اس مورخ کے نزدیک گویا قدرت کے قانون کا آخری نتیجہ ہے اور دنیا نے جہاں پہنچنا تھا بالآخر پہنچ گئی۔

نومبر ۱۹۹۰ء میں شہرہ آفاق مصنف ایلون ٹافلر Alvin Toffler کی کتاب Powershift شائع ہوئی۔ یہ امریکی عمرانی مفکر Social thinker علم المستقبلیات (Futuristic Studies) میں سب سے بڑی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی کتابیں دنیا کے پچاس سے زائد ملکوں میں پڑھی جاتی ہیں ۔ رچرڈ نکسن سے لیکر گورباچوف تک نے اس کی کتابوں کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔ اور سابق چینی وزیراعظم ژہائیو زیانگ (Zhao Ziyang) نے تو اسکی ایک کتاب Third Wave پڑھنے کے بعد اپنے ملک کے پالیسی ساز سکالروں کی کانفرنس بلا کر کتاب کے مندرجات پر باقاعدہ بحث و مباحثہ کا اہتمام کیا تھا۔ ان تمام باتوں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مفکر کے افکار کو عالمی سیاست میں کیا مقام حاصل ہے۔ پاورشفٹ میں ایلون ٹافلر اکیسویں صدی کی جمہوریت کا ذکر کرتا ہے جو سرمایہ درانہ جمہوریت سے مختلف ہوگی اور اس کا مکمل انحصار سیکولر اور مادی علوم پر ہوگا۔ اس میں ٹافلر نے ان خطرات کا ذکر کیا ہے جو مستقبل کی جمہوریت کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ کتاب میں ان خطرات کے ذکر کیلئے ایک مکمل باب "Yearning for Dark Ages" کے نام سے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ باب اس جملے پر ختم ہوتا ہے۔

In the Power Shift Era ahead, the primary ideological struggle

will no longer be between capitalist democracy and Communist totalitarianism but between 21st century democracy and 11th century darkness.

مصنف کے نزدیک "گیارھویں صدی کی ظلمت" کے عناصر ترکیبی تین ہیں۔

1- Holy Frenzy
2- Ecotheocracy
3- Xenophobes

یہاں ان عناصر ترکیبی کی تشریح کا موقع نہیں ۔ دلچسپی رکھنے والے احباب کتاب دیکھ سکتے ہیں البتہ میں ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ Holy frenzy سے ایلون ٹافلر کی مراد Funda mentalism ہے جس کی اس کے نزدیک سب سے بڑی علامت آیت اللہ خمینی ہیں۔ اور اس علامت کو وہ ایک ریاضیاتی فارمولا (Equation) کی صورت میں یوں بیان کرتا ہے:

Love of Allah + Hatred of Imperialism + Anti capitalism = A triple charged brand of fanaticism that turned the Middle East into a tinderbox.

غرض ایلون ٹافلر کے نزدیک جمہوریت کو سب سے بڑا خطرہ منظم مذہب (Organised religion) کی طرف سے ہے چنانچہ وہ علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ گزشتہ تین صدیوں میں شدید کشمکش کے بعد جمہوریت کی سیکولر قوتوں نے مذہب کی گرفت سے انسانی ذہن کو آزاد کروایا تھا اور بڑی مشکل سے مذہب کو سکولوں سے ' اخلاقیات سے اور مملکت سے بے دخل کیا تھا لیکن اب خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب از سرنو ابھر رہا ہے۔

افکار جمہوریت کے اس عمد بہ عمد تجزیے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج جمہوریت جس نظام حیات کی علمبردار ہے' اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے جس کی جڑ لادینیت (Secularism)' تنا سرمایہ دارانہ جمہوریت (Capitalist democracy)' فروع اور برگ وبار ایک عیش کوشانہ تمدن (Sensate Culture) ہیں۔ اسے ہم قرآن کے الفاظ میں "شجر خبیثہ" کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ اس پر "شجر طیبہ" کا پیوند کیسے لگے گا اور کہاں لگے گا؟۔ غرض اس زمانے میں جمہوریت کی Connotation بالکل سیکولر ہو چکی ہے۔ اوراب آپ "اسلامی جمہوریت" کا نام بھی لیں تو لوگ اس سے جمہوریت کا وہی مفہوم لیتے ہیں جو اس وقت انہیں ملک میں عملاً سامنے نظر آرہا ہے یا اس وقت پوری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ جمہوریت کے لفظ کے دائرہ مفہوم (Semantic field) میں اسلامی تصورات داخل کرنے کی اب سرے سے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسلئے میں عرض کروں گا کہ جمہوریت کا لفظ مسلم معاشرے میں بڑی کنفیوژن کا موجب بنتا ہے ' اسلئے اسے ترک کر دینا چاہئے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جمہوریت کے مقابلے میں ہمارے لئے خلافت کی اصطلاح کفائت نہیں کرتی جس میں صالح قیادت پیدا کرنے بھی کا مفہوم سمویا ہوا ہے۔

ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم نے "وامرھم شوری بینھم" والی آیت کو "آیت جمہوریت" قرار دے کر جمہوریت کو چھٹا رکن دین قرار دے رکھا ہے اور پھر جمہوریت کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کبھی امیر جماعت اسلامی کو لیزر شوز کا پاسبانی طریقہ اپنانا پڑتا ہے اور امیر تنظیم اسلامی کو باکراہ محترمہ بینظیر کو سربراہ مملکت قبول کرنے کی مجبوری پیش آجاتی ہے اور پھر اس موقف کی تائید میں اپنی تحریر و تقریر کی کچھ نہ کچھ توانائیاں بھی صرف کرنی ہی پڑتی ہیں۔ اگر جمہوریت سے جان چھڑالی جائے تو شاید یہ مجبوریاں لاحق نہ ہوں۔ میں مکرر عرض کروں گا کہ "جمہوریت" کے مقابلے میں "خلافت" بڑی ہی پاکیزہ اصطلاح ہے۔ اس میں جمہوریت کا سیکولر مفہوم داخل نہ کیجئے۔ اگر خلافت کے مفہوم کے ابلاغ میں واقعی کوئی کمی ہے جسے پورا کرنا مقصود ہے تو اپنی "آیت جمہوریت" میں سے شوری' مشاورت یا شورائیت کا لفظ لے لیجئے اور اس کے مفہوم کی وضاحت دور خلافت راشدہ کے حوالے سے کیجئے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مزید ایک گزارش کرنی ہے جس کا موضوع زیر بحث سے شاید کچھ زیادہ تعلق نہیں تاہم بات ہے بڑی اہم۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ قرون وسطی میں تصوف نے مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے امور سلطنت کو معمولی ذہنی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے حوالے کر دیا جس کے نتیجے میں دنیا کی امامت ان سے چھن گئی اور ہمارے دور میں یہ حادثہ پیش آیا ہے کہ مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو سیاست ہڑپ کر گئی ہے اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا وہ مشن جسے خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کسی زمانے میں "کرنے کا اصل کام" قرار دیا تھا نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ قوم اب اس علمی رہنمائی سے بھی محروم ہو گئی ہے جس کی قوم کو موجودہ دور کی Knowledge Based Society کو اشد ضرورت ہے۔

امریکہ نے علم کے زور پر دنیا پر اپنا تہذیبی تسلط قائم کر رکھا ہے اور ہمارے لوگ اس تہذیب کے روز بروز زیادہ سے زیادہ دلدادہ ہوتے جا رہے ہیں اسلئے جب امریکہ نیو ورلڈ آرڈر کی باتیں کرتا ہے تو اسے زیب بھی دیتی ہیں۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر رفیع الدین موحوم کا یہ قول کس قدر مبنی بر حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں قومیں حکیمانہ اور فلسفیانہ نظریات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اور اس دور میں وہی قوم دنیا پر اپنا تسلط قائم رکھ سکتی ہے جس کے پاس معقول اور دلکش تصورات کی قوت ہوگی۔ اگر ہمارے پاس بقول اقبال ۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

تو کیا کسی کو یہ سامان پیدا کرنے کی فکر بھی ہے یا ساری کی ساری توانائیاں سیاست کی نذر ہوتی رہیں گی۔ اور اقامت دین کی جدوجہد میں تفقہ فی الدین کا فریضہ فراموش کر دیا جائے گا!۔ و ما علینا الا البلاغ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کا مقصد بعثت
ڈاکٹر اسرار احمد
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
اشاعت خاص -/۲۰ روپے عام - /۱۰ روپے

قرآن حکیم کی سورتوں
کے مضامین کا
اجمالی تجزیہ
ڈاکٹر اسرار احمد
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
اشاعت خاص -/۴۰ روپے ' عام -/۲۰ روپے

وہی سانحہ دوہرایا تو نہیں جارہا؟ (قسط اول)

سندھ اور مشرقی پاکستان

دودھ کے جلے کو چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینی چاہیے

محمد سمیع۔ کراچی

جب سے سندھ میں ملٹری آپریشن شروع ہوا ہے مختلف حلقوں سے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ خدانخواستہ سندھ میں سابق مشرقی پاکستان جیسی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ یہ خدشہ کس حد تک درست ہے اس کو سمجھنے کے لئے پاکستان کے ان دونوں صوبوں کے حالات کا تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔ آیئے پہلے ہم سابق مشرقی پاکستان کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔

پاکستان کا یہ صوبہ ہر لحاظ سے اہمیت کا حامل تھا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اسے مسلم لیگ کی جائے پیدائش کی حیثیت حاصل تھی۔ مسلم لیگ کے قیام اور اس کے استحکام میں نواب سر سلیم اللہ کا اہم کردار تھا تاہم چونکہ غیر منقسم ہندوستان کے اس صوبے میں ہندو اقلیت کا بڑا عمل دخل تھا لہٰذا وہاں کی مسلمان اکثریت پر ہندوؤں کو بالادستی حاصل تھی۔ اس کے باوجود یہاں کے بنگالی مسلمان نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پاکستان دونوں کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور اسکی حیثیت ایک جمہوری ریاست کی تھی لہٰذا مشرقی پاکستان کے لوگوں کا ملک کے اقتدار پر زیادہ حق تھا لیکن ابتدا ہی سے ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا جس نے ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر دئے۔ خواجہ ناظم الدین کو پہلے گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر وزیراعظم بنایا گیا پھر برطرف کر دیا گیا۔ حسین شہید سہروردی نے ملک میں حزب اختلاف کو مضبوط کیا جو ایک جمہوری ریاست کے لئے ناگزیر ادارہ ہے لیکن ان کے ساتھ بھی ناانصافی کی گئی۔ ایوب خان کے زمانے میں ان کا انتقال بیروت میں جن حالات میں ہوا اس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کئے۔ مشرقی پاکستان کی اکثریت ختم کرنے کے لئے پہلے پیریٹی کا اصول اپنایا گیا اور اس کے بعد ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا۔

یہ وہ حالات تھے جنہوں نے عوام میں احساس محرومی پیدا کیا جس کا پورا فائدہ حسین شہید سہروردی کے نالائق شاگرد شیخ مجیب الرحمن نے اٹھایا۔ اور اس کے باوجود کہ ایوب خان کے دور میں مشرقی پاکستان کو نمایاں ترقی دی گئی' مارشل لاء کے نفاذ میں بنگالیوں نے پنجاب کی بالادستی کو بری طرح محسوس کیا کیونکہ نسبت و تناسب کے لحاظ سے فوج میں پنجاب اور بنگال کے لوگوں میں کوئی مقابلہ نہ تھا۔ جس زمانے میں سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا ہے' فوج میں جس بنگالی آفسر کو سب سے اونچا عہدہ حاصل تھا وہ بریگیڈیر کا تھا۔ گو کہ قوم پرستوں کے مقابلے میں ایوب خان نے فضل القادر چودھری اور خان اے صبور جیسے قومی سطح کے لیڈروں کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کیا لیکن صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ عوام میں ان کا کوئی اثر و رسوخ نہیں رہا تھا۔

دوسری طرف ہندوستان کو چونکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں خاصی خفت کا سامنا کرنا پڑا تھا لہٰذا اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ پاکستان کو ہر حال میں کمزور کرنا ہے اور اس کے لئے اسے مشرقی پاکستان کی زمین میں خاصی زرخیزی نظر آئی۔ لہٰذا اس نے مشرقی پاکستان میں اپنے ففتھ کالمسٹ کو داخل کر دیا جنہوں نے تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان کی احساس محرومی میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔

ایوب خان کے زمانے میں شیخ مجیب الرحمن کے خلاف اگر تلہ سازش کا مقدمہ قائم کیا گیا لیکن اس مقدمے کو بھی حکومت نے مناسب طور پر نہیں لڑا۔ جب ایوب خان کی گرفت اقتدار پر کمزور پڑنے لگی اور ذوالفقار علی بھٹو ان کے خلاف ایک عوامی تحریک لیکر اٹھ کھڑے ہوئے تو حالات کے جبر نے ایوب خان کو سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس بلانے پر مجبور کر دیا۔ اس موقع پر ہمارے لیڈر اس بات پر اڑ گئے کہ شیخ مجیب الرحمن کو رہا کیا جائے اور انہیں گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ لہٰذا شیخ مجیب الرحمن کو پیرول پر رہا کیا گیا جس نے مشرقی پاکستان میں اس کی عوامی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔

ایوب خان کے بعد یحیٰی خاں نئے مارشل لاء کے ذریعہ برسراقتدار آئے تو انہوں نے ایک کارنامہ یہ انجام دیا کہ ایک نہایت ہی صاف ستھرا الیکشن کروایا جس کے نتیجے میں ہی پاکستان وجود میں آیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ انتخابات لیگل فریم ورک کے تحت کروائے جائیں گے اور اس سلسلے میں مارشل لاء آرڈر بھی جاری ہوا لیکن اس پر عملدرآمد پر زور نہیں دیا گیا۔ ایک طرف شیخ مجیب الرحمن کا مغربی پاکستان اور خصوصاً پنجاب کے خلاف پروپیگنڈا تھا تو دوسری طرف حکومت کی طرف سے اس پراپیگنڈے کا کوئی توڑ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالی عوام نے شیخ مجیب الرحمن کے فرمودات پر مکمل اعتماد کیا۔ تابوت پر آخری کیل مشرقی پاکستان کا سمندری طوفان بنا جس کے نتیجے میں یہاں بھیانک تباہی ہوئی۔ اس میں حکومت کی طرف سے موثر امداد نہ ہونے کی بناء پر عوام کی بدگمانیوں میں اور اضافہ ہوا اور مولانا عبدالحمید خان بھاشانی جیسے لیڈر نے بھی عوامی اجتماعات میں پاکستان کو خدا حافظ کہہ دیا۔

ان تمام حالات کے نتیجہ میں عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں سوائے نورالامین کے حلقہ کے تمام سنٹروں پر کامیاب ہو گئی اور مغربی پاکستان میں پیپلزپارٹی اکثریتی پارٹی بن کر ابھری۔ جمہوری عمل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اقتدار عوامی لیگ کو سونپ دیا جاتا لیکن پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیا جاتا رہا پھر بعد از خرابی بسیار یحیٰی خان نے اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کیا تو بھٹو صاحب راستے کی رکاوٹ بن گئے۔ پہلے تو اسمبلی میں شرکت کرنیوالوں کی

ٹانگیں توڑنے کا اعلان کیا پھر شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ مذاکرات کا ڈرامہ رچایا۔ ان مذاکرات میں بھٹو صاحب شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات میں ساڑھے چار نکات پر راضی ہو گئے لیکن اس سے آگے وہ بڑھ نہ سکے۔ نتیجہ سول نافرمانی کی صورت میں ظاہر ہوا اور مارشل لاء حکومت کی موجودگی میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن کے احکامات پر عمل کیا جانے لگا۔ ٹیکسوں کی ادائیگی روکی گئی۔ روپے کی مغربی پاکستان کی منتقلی کو روکنے کے لئے بینکوں کو احکامات جاری کئے گئے کہ چیک پر ادائیگی بند کر دیں۔ جب صورت حال حد سے زیادہ بگڑ گئی تو آرمی ایکشن شروع کیا گیا۔ آرمی ایکشن کا انداز کچھ ایسا تھا کہ جو شیخ مجیب الرحمن کے مخالف تھے وہ بھی اس کے حامی بن گئے۔ وہ بنگالی جنہوں نے پاکستان بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا یہ کہتے سنے گئے کہ ہندوؤں کی غلامی قبول ہے لیکن مغربی پاکستان کی غلامی منظور نہیں۔ عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت تو ہندوستان فرار ہو گئی' آرمی ایکشن کا نشانہ بنگالی عوام بنے۔ ایک طرف تو مکتی باہنی کے روپ میں ہندو نوجوانوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا دوسری طرف فوج بھی ان کو مجرم گردان رہی تھی لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ ان حالات میں تو بہتر یہ ہے کہ مکتی باہنی ہی کا ساتھ دیا جائے۔ یہ بات ایک بزنس مین نے ایک بینک میں گفتگو کے دوران کہی کہ ایک طرف تو ہمیں مکتی باہنی والے لوٹتے ہیں اور فرار ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف فوج ہمارا محاصرہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ان لوگوں کو ہمارے حوالہ کرو۔ ان حالات میں ہمارے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ کار ہے کہ جب فوجی بھی ہم پر اعتماد نہیں کرتے تو کیوں نہ ہم اپنے لوگوں کا ہی ساتھ دیں۔

اس آرمی ایکشن کے نتیجے میں ایک خانہ جنگی کی صورتحال پیدا ہو گئی۔ لاکھوں مسلمان جن میں بنگالی' بہاری' پنجابی اور دوسرے لوگ شامل تھے بیدردی سے قتل کئے گئے صورت حال یہ تھی کہ جس کا جہاں پلڑا بھاری تھا وہ کمزوروں کو مار رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے بڑھ کر عذاب اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سارے معاملے میں سب سے بڑا کردار ادا کرنے والی تو پیپلزپارٹی تھی لیکن مغربی پاکستان کے سیاستدانوں میں سے سوائے اصغر خان اور ولی خان کے کسی دوسری سیاسی پارٹی یا سیاستدان نے مظلوموں کے حق میں کلمہ خیر نہیں کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت دولخت ہوئی کیونکہ ہندوستان نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور روس کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ۹۳ ہزار فوجی اس ہندو قوم کے قیدی بنے جس پر ان کے اسلاف نے ایک طویل عرصے تک حکومت کی۔ جبھی تو اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے۔

اب اس قافلے کی جڑیں دور ونزدیک پھیل رہی ہیں۔ بیداری کی اس لہر نے دینی سیاسی جماعتوں کے انقلابی زعماء کو بھی دل کی بات سر محفل کہہ دینے کی موافق فضا مہیا کی ہے جو ایک عرصہ سے نجی محفلوں میں تو اس رائے کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ نفاذ اسلام انتخابی جدوجہد کے ذریعہ نہیں ہو سکتا لیکن عوامی اور صحافتی سطح پر کھل کر اسے پیش نہیں کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے سامنے جمعیت علماء اسلام کے پارلیمانی لیڈر ممبر قومی اسمبلی محترم جناب مولانا محمد خان شیرانی صاحب کا ایک حالیہ اخباری بیان ہے جو انہوں نے ۲۰ر اگست کو جے یو آئی راولپنڈی کی طرف سے دیئے گئے عشائیہ کے موقع پر دیا۔ انہوں نے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں انتخابی سیاست کو نظام کی تبدیلی کے لئے کار عبث قرار دیا اور اپنی مرکزی قیادت سے انتخابی سیاست ترک کر دینے کی اپیل بھی کی ——— جس رائے پر انہیں انشراح صدر ہو چکا ہے' اسے وہ لائحہ عمل بنانے کے لئے جمعیت کے مرکزی پلیٹ فارم پر پوری قوت سے پیش کریں اور مرکزی قیادت کو طریقہ کار کی اس بنیادی تبدیلی پر مائل کریں۔ تاہم جذبہ خیر خواہی کے تحت ہم زعماء جمعیت کی توجہ ایک اہم بات کی طرف بھی دلانا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ کہ انتخابی سیاست سے دستبرداری کا عزم ایک مستحسن قدم ہے لیکن اس کے متبادل رستے کا بھی قائدین جمعیت کو سیرت نبویؐ کی روشنی میں ابھی سے فیصلہ کر لینا چاہیے۔ کہیں خدانخواستہ ایک کھائی سے نکل کر کسی دوسرے کنویں میں گرنے کی صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ ہم یہ خدشہ اس بیان کے حوالے سے ظاہر کر رہے ہیں جو محترم جناب مولانا فضل الرحمان نے اسلامی جمہوری محاذ کے پہلے جلسے منعقدہ پشاور سے خطاب کرتے ہوئے دیا تھا کہ "اگر ہم نے محسوس کیا کہ انتخابات کے ذریعہ تبدیلی ناممکن ہے تو پھر ہم کلاشنکوف اٹھائیں گے' اگر افغانستان اور کشمیر میں جہاد ہو سکتا ہے تو پاکستان میں کیوں نہیں ہو سکتا!"۔

ہم اس حد تک تو مولانا صاحب سے اتفاق کرتے ہیں کہ جہاد ہونا چاہیے کیونکہ جہاد کے بغیر تو ملت پر جمود طاری ہو جاتا ہے لیکن یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ بحالات موجودہ جبکہ دعوت دین مطلوبہ معیار تک نہیں پہنچائی جا سکی' جہاد

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

کیا جمعیت علماء اسلام میں بھی انقلابی فکر پروان چڑھ رہی ہے؟

ابو عمیر مہرانی۔ اسلام آباد

الحمدللہ' امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب طویل مدت سے یہ نعرہ مستانہ بلند کر رہے ہیں کہ "انتخابات کے ذریعہ پہلے سے قائم نظام کو چلانے والے بہتر ہاتھ مہیا کئے جا سکتے ہیں لیکن اس نظام کو جڑ سے اکھاڑا نہیں جا سکتا کیونکہ نظام ہمیشہ انقلاب ہی سے بدلے جاتے ہیں"۔ امیر محترم جہاں عوام الناس میں یہ دعوت مسلسل پیش کرتے آ رہے ہیں' وہاں ساتھ ہی' وقتاً فوقتاً دینی سیاسی جماعتوں کی قیادت وزعماء سے نجی ملاقاتوں اور خطابات جمعہ میں یہ اپیل بھی کرتے رہتے ہیں کہ خدارا انتخابی کشمکش سے دستبردار ہو کر منہج نبویؐ پر چلتے ہوئے انقلاب کے لئے راہ ہموار کریں۔

بارے خدا خدا کر کے اب یہ جمود رفتہ رفتہ ٹوٹ رہا ہے اور انقلابی طریقہ کار کے حق میں دلوں کے اندر پوشیدہ تائید اب منظر عام پر آنا شروع ہو گئی ہے۔ سال گزشتہ سے تحریک خلافت کے سلسلے میں پورے ملک میں جلسوں کے انعقاد سے جہاں عوام الناس میں اس مقصد کے لئے عملی تعاون کا جذبہ پیدا ہوا ہے اور بقول شاعر

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
راہرو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

سیف انداز بیاں بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

انقلاب کا غلط فلسفہ!

اس اختلاف میں تو اتفاق کی جھلک ملتی ہے

محمد صدیق قمر۔ مورد کرم۔ قبولہ شریف

محمد صدیق قمر کی اس مختصر لیکن خوبصورت تحریر کے بعد آئندہ شمارے میں وہ جواب پڑھئے گا جو خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے معترض ڈاکٹر محمد امین صاحب کو نوائے وقت کے ذریعے ہی دیا ہے۔ مدیر

۵ ر اور ۷ ر اگست کے "نوائے وقت" میں محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کا دو قسطوں پر مشتمل مضمون "انقلاب کا غلط فلسفہ" نظر سے گزرا۔ ڈاکٹر امین صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریک خلافت کے مجوزہ طریق انقلاب کا محاکمہ فرمایا ہے۔ ضمناً یہ امر ملحوظ نظر رہے کہ فلسفہ انقلاب اور طریق انقلاب دو جدا جدا معرض ہیں۔ فلسفہ انقلاب سے مراد اقدار حیات اور معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کی عملی تنظیم کا وہ نقشہ ہے جسے کوئی انقلابی قائد موجود نظام زندگی کو ہٹا کر اس کی جگہ نافذ اور برپا کرنا چاہتا ہے جبکہ طریق انقلاب سے مراد مراحل کی وہ ترتیب یا وہ طریق کار ہے جو موجودہ نظام کو ہٹانے اور انقلابی قائد کے ذہن میں موجود نقشہ زندگی کو عملاً برپا کرنے کے لئے اختیار کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر امین صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد کے مجوزہ طریق انقلاب پر خامہ فرسائی کی کوشش کی ہے، فلسفہ انقلاب کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ بہر حال وہ اپنے مضمون کا عنوان "طریق انقلاب کا غلط فلسفہ" یا "غلط طریق انقلاب" وغیرہ رکھتے تو عنوان یقیناً درست ہوتا۔

قبل اس کے کہ ڈاکٹر امین صاحب کے تحریر کردہ اس محاکے کا محاکمہ کیا جائے، میں چند معروضی حقائق اور اپنے وہ تاثرات بیان کرنا چاہتا ہوں جو "انقلاب کا غلط فلسفہ" پڑھتے ہی میرے ذہن پر مرتب ہوئے۔

۱۔ میں ڈاکٹر امین صاحب کے علمی قدوقامت اور شعبہ جاتی تخصیص سے آگاہ نہیں ہوں اور اس اعتبار سے میرے سامنے ان کا صرف یہ ایک مضمون ہے جسے میں ان کی شخصیت کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے حالات موجودہ اور عقل و استدلال کے تناظر میں دیکھنے کی زیادہ سہولت رکھتا ہوں۔

۲۔ بہ دقت نظر "انقلاب کا غلط فلسفہ" پڑھنے کے بعد آدمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے طریق انقلاب کا پہلے سے بھی بڑھ کر قائل ہو جاتا ہے کہ اگر اس قدر "دانشوری" خرچ کر کے بھی ڈاکٹر اسرار احمد کے مجوزہ طریق انقلاب کی تردید میں کوئی ایک بھی ٹھوس نکتہ اختلاف پیش نہیں کیا جا سکا تو گویا "انقلاب کا غلط فلسفہ" تغلیط برائے تغلیط، تردید برائے تردید اور اختلاف برائے اختلاف کی وہ "دانشورانہ" کاوش ہے جس میں خود دانش بھی سرد گریباں نظر آتی ہے۔

۳۔ ڈاکٹر امین صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کی بین السطور کیفیت کچھ یوں سامنے آتی ہے کہ:

ا۔ ڈاکٹر امین صاحب کا مقصد ڈاکٹر اسرار احمد کی تردید، تغلیط اور تکذیب ہے نہ کہ ان کے فلسفہ انقلاب یا مجوزہ طریق انقلاب کی۔

ب۔ ڈاکٹر امین صاحب نے بیشتر مقامات پر اختلاف برائے اختلاف کی کوشش کرتے ہوئے تکلف بلکہ کافی تکلیف کے ساتھ سیدھے کان پکڑنے کی بجائے پورے سر کا چکر کاٹ کر کان پکڑنے کی وہ "دانشورانہ" سعی کی ہے جو مایوس، بے عمل اور آج کل کے حقیقتاً سنگی اور بظاہر "ڈسکو سے دانشوروں" کا طرہ امتیاز ہے۔

ج۔ پاکستان میں جماعت اسلامی کے انقلابی کردار کے خاتمے اور علامہ طاہرالقادری کی ڈرامائی انقلابیت کے بن کھلے مرجھا جانے کے بعد طریق انقلاب کے باب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کوششوں سے لوگوں کے ذہنوں میں وضاحت اور یکسوئی کی جو ایک کیفیت پیدا ہو رہی ہے، ڈاکٹر امین صاحب کا یہ مضمون اس وضوح ذہنی پر منتشر خیالی، مایوسی اور کنفیوژن کی گرد ڈالنے کی شعوری یا غیر شعوری اور ناکام کوشش ہے۔

د۔ ڈاکٹر امین صاحب کے یہ جملے "اس صدی میں اٹھنے والی اسلامی تحریکوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب بدلے ہوئے حالات میں نیا سیاسی نظام اپنی ساری برائیوں کے باوجود حکومت کی تبدیلی کا موقع مہیا کرتا تھا اور عوام تک اپنی بات پہنچانے کا موقع دیتا تھا، خلافت کے زمانے کی پرانی پالیسی پر عمل کرنے کی کوئی مجبوری نہیں، لہٰذا سیاست میں براہ راست حصہ لیتے ہوئے وہ مسلمان حکمرانوں کے مقابلے میں اتر آئے۔ مغرب اور اس کے پروردہ حکمرانوں نے ہر ناجائز ہتھکنڈہ اختیار کیا اور ان کو ناکام بنا دیا، اس سے تلخی پیدا ہوئی اور ان تحریکوں میں انتہا پسند گروہ پیدا ہونے لگے" اس اعتبار سے قابل غور ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو وہ انتہا پسند گروہ میں شامل کرتے ہیں اور وہ خود اس گروہ کا حصہ بنے جو مایوس، بددل اور منتشر خیال ہو گیا اور جبر و استحصال کی نمائندگی کرنے والوں کے لئے اس طرح کے نسخے تجویز کرنے لگا کہ "حکمران

طبقوں کو ان کی ذہنی اور سماجی سطح کے مطابق ایسا تعلیمی اور تربیتی ماحول فراہم کرنے کی کوشش کی جائے جس سے وہ اسلام کی حقانیت پر نہ صرف علمی و فکری سطح پر یکسو ہو جائیں بلکہ عملی مسلمان بھی بن جائیں" حالانکہ جس استحصالی اور منافقانہ نظام کے ساتھ ان مترفین کے مفادات اور بقاء وابستہ ہے ' وہ انہیں اس سطح پر لے آیا ہے کہ وہ ہر شے اور ہر قدر سے بے پروا ہیں اور یہاں "دانشوری" وش فل تھنکنگ کا جال پھیلا کر ہر مزاحمتی فکر اور تدبیر کو اسیر "دانشوری" کرنا چاہتی ہے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ ڈاکٹر امین صاحب کا نقش قدم یوں بھی ہے کہ "حکمرانوں کی نافرمانی یا عدم اطاعت کی اجازت آپؐ نے صرف تین صورتوں میں دی ہے' ایک جب وہ خلاف شریعت باتوں کا حکم دیں کہ خالق کے احکام کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی' دوم جب وہ بنیادی دینی فرائض ترک کر دیں اور تیسرے جب وہ کھلم کھلا اعمال کفر کا ارتکاب کریں"۔

ان سطور پر دو سوال ڈاکٹر امین صاحب کے ذمہ ہیں:۔

ا۔ "انقلاب کا غلط فلسفہ" میں ان کا یہ فرمانا کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ مراحل انقلاب انہوں نے سیرت نبویؐ سے مستنبط کئے ہیں اور سیرت ہی ان کا واحد ماخذ ہے' شرعی اور فقہی لحاظ سے یہ استنباط بہت کمزور ہے" اس سوال کو جنم دیتا ہے کہ کیا "انقلاب کا غلط فلسفہ" میں ان کی اول الذکر سطور میں جو استنباط کیا گیا وہ کمزور نہیں ہے؟

۲۔ کیا ہمارے حکمرانوں نے نص صریح کی مخالفت میں شریعت کورٹ کے سود کی بابت فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج نہیں کیا؟۔ کیا یہ چیلنج اور شریعت کورٹ کے فیصلے کو غیر موثر کرنے کی دیگر کوششیں ایک طرف معصیت خالق کو جبراً نافذ کرنے کی کوشش نہیں ہیں؟

ایک طرف اگر ہم ڈاکٹر امین صاحب کے افکار عالیہ کا بہ نظر عمیق جائزہ لیں اور ان کے متذکرہ بالا ایک "استدلال" کو پیش نظر رکھیں اور ادھر ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب "منہج انقلاب نبویؐ" کو بنظر غائر پڑھیں تو ڈاکٹر صاحب نے حضور اکرمؐ کے برپا کردہ انقلاب کے مراحل کو تاریخی حقائق و شواہد کے تناظر میں مجرداً بیان کیا ہے۔ یہ استنباط نہیں بلکہ مراحل انقلاب نبویؐ کا بیان ہے۔ ان کی اباحت و وجوب پر بحث میں پڑے بغیر اس امر سے اختلاف ممکن نہیں کہ امت پر واجب ہے کہ وہ زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی معاملے میں اصولی ہدایت قرآن و سنت ہی سے لے اور پھر حالات زمانہ اور روح عصر کے تحت اس اصولی ہدایت کا اطلاق بذریعہ اجتہاد ہو گا۔

ظاہر ہے کہ منہج انقلاب نبویؐ ہی اقامت دین کو متحقق کرنے کے لئے اصولی ہدایت ہے البتہ مسلمانوں کے معاشرے میں اقامت دین کے سلسلے میں روشنی سیرت النبیؐ ہی سے لی جائے گی اور اسے روح عصر کے تقاضوں کے تحت منطبق کیا جائے گا۔

ڈاکٹر امین صاحب کے بقول "اسلامی نقطہ نظر سے مطلوب تغیر پیدا کرنے کا جو ایشی فارمولا قرآن مجید نے ہمیں دیا ہے وہ ہے تعلیم و تزکیے کا عمل حکمت کے ساتھ انفرادی و اجتماعی اصلاح و تغیر" پھر انہوں نے تعلیم و تربیت یا دعوت و تزکیے کے اس عمل کی تین اہم شکلیں یہ گنوائی ہیں۔

ا۔ تبلیغ

۲۔ انذار

۳۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ڈاکٹر امین صاحب نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو "اپنے دائرہ اختیار" کے ساتھ مقید کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس "دائرہ اختیار" کا تعین کہاں سے کیا جائے؟۔ کس منبع علم سے یہ "دائرہ اختیار" اخذ کیا جا سکتا ہے؟۔ قرآن حکیم کا یہ ارشاد کہ "تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو (عالم انسانیت) کو بھلائی کی طرف بلائے' نیکی کا حکم دے اور برائیوں سے روک دے" قرآن حکیم "دائرہ اختیار" کی نہیں ممکنہ و مطلوبہ دائرہ اثر و نفوذ کی بات کرتا ہے اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے مجوزہ طریق انقلاب میں ابھی تک جو عملی مظاہرے کئے ہیں وہ تبلیغ ' انذار' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کی ہیئات کذائی ہیں جن میں معاشرے کے اندر فساد و انار کی پیدا ہونے کا کوئی خدشہ نہیں۔ کتبوں اور بینروں کے ساتھ خاموش مظاہرے جہاں طبقہ ء مترفین کو جھنجھوڑنے کے لیے ہیں وہاں عوامی شعور کی بیداری کا بھی سامان ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی انتھک کاوشوں کے ساتھ تبلیغ و انذار کا فریضہ ادا کرتے ہوئے خواص و عوام کے اندر اثر و نفوذ کی کوششیں وہی اکثریت مہیا کرنے کے لئے کر رہے ہیں جس کی ضرورت کو ڈاکٹر امین صاحب نے یوں بیان کیا ہے "اگر کسی ملک کے عوام کی اکثریت اسلامی تحریک کی پشت پر ہو تو بلٹ کی بجائے یہ انقلاب بیلٹ کے ذریعے بھی آ سکتا ہے۔ جلسے جلوسوں' مظاہروں اور سول نافرمانی کے ذریعے بھی آ سکتا ہے جو آج کے سیاسی منظر میں قابل قبول اقدامات ہیں"۔ اگر ڈاکٹر امین صاحب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے طریق انقلاب کا بغور مطالعہ کریں تو انہیں محسوس ہو گا کہ جہاں موثر اقلیت انقلاب کی داعی ہمنوا ہوتی ہے وہیں سے اکثریت کے اسلامی تحریک کی پشت پر ہونے کے دروازے کھلتے ہیں اور پھر بیلٹ بھی تبدیلی کا ذریعہ بن سکتا ہے اور ڈاکٹر امین صاحب کے بقول سول نافرمانی بھی جسے بغاوت یا تخت یا تختہ کا عنوان دے دینا اسی "انتہا پسندی" کا نتیجہ ہے جو ڈاکٹر امین صاحب کو "سول نافرمانی" تک لے آئی ہے۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

ڈاکٹر امین صاحب نے اپنے مضمون کے آخری حصے میں ڈاکٹر اسرار احمد سے اتفاق نہ کرنے کے انداز میں اتفاق کر ہی لیا ہے۔ ادھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب انقلابی تحریک عملی طور پر آگے بڑھتی ہے تو روح عصر کے تقاضوں کے تحت طریق کار کی بعض معمولی تبدیلیاں بصیرت و ژرف نگاہی پر دلالت کرتی ہیں جبکہ بنیادی مراحل میں کچھ فرق نہیں آیا کرتا اور تحریک کو عملاً چلانے والے لوگ ہی اس کی رفتار نبض سے آگاہ ہوتے ہیں۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

میرے خیال میں ڈاکٹر امین صاحب کوئی ایک بھی بنیادی نقطہ اختلاف نہیں رکھتے اور اگر حسن نیت کے ساتھ ابہام کا شکار ہیں تو انہیں ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کر کے قائل کرنے یا خود قائل ہو جانے کا راستہ اپنانا چاہئے اگرچہ ان کے "غلط فلسفہ انقلاب" کو ڈاکٹر اسرار صاحب کے مجوزہ طریق انقلاب کے تناظر میں رکھ کر بے اختیار یہ شعر لبوں پہ آ جاتا ہے کہ۔

سیفؔ انداز بیاں بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

بقیہ جمعیت علماء اسلام

باللسان اور جہاد بالقلم تو ہو سکتا ہے لیکن جہاد بالسیف کیلئے ہمیں فقہاؒ کی قائم کردہ ان شرائط کا لحاظ رکھنا ہو گا جو انہوں نے مسلمان حاکم کے خلاف خروج کے لئے مقرر کی ہیں کہ دعوت کے ذریعہ اس حد تک قوت مہیا کی جائے جس سے بظاہر کامیابی یقینی نظر آتی ہو۔ ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے دینی سیاسی جماعتوں کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ انتخابی سیاست کو ترک کر کے اپنی تمام تر صلاحیتیں توسیع دعوت میں کھپا دیں تاکہ جب خود دین پر کاربند جانثاروں کی معتدبہ تعداد تیار ہو سکے تو اس مرحلے پر نظام باطل کو للکارا جائے اور عمرانی ارتقاء سے جو ایک اہم حق اس دور میں شہریوں کو ملا ہے یعنی پر امن اور منظم تحریک کے ذریعہ حکومت کو تبدیل کرنا' اس حق کو استعمال کرتے ہوئے منظم لیکن پر امن مظاہروں اور پکٹنگ کے ذریعہ نظام باطل کے نگہبانوں کو للکارا جائے کہ ان سرفروشوں کی موجودگی میں احکام الٰہی سے بغاوت برداشت نہیں کی جائے گی۔

یوں ایک ایک منکر کو لیکر حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ان ان امور میں اطاعت الٰہی و اطاعت رسولؐ اختیار کی جائے۔ اس مرحلے پر یا تو حکومت پسپائی اختیار کرتی جائے گی اور انقلابی قوت کا ایک ایک کرکے پورے نظام اجتماعی کو دین حق میں ڈھالنے کے لئے مسلسل دباؤ بڑھتا چلا جائے گا۔ یا حکومت اس انقلابی گروہ پر پوری قوت سے حملہ آور ہو گی' اسے نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی اور اسی مرحلے پر استقامت ہی انقلابی قوت کا اصل امتحان ہو گا۔ یہاں پہنچ کر صبر کے ساتھ قربانیاں دیتے ہوئے بھی حکومت کی ناکامی کا سامان کیا جا سکتا ہے کیونکہ آج کے دور میں نہتے عوام پر حکومت زیادہ دیر تک ظلم روا نہیں رکھ سکتی اور اسے انقلابیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر راہ فرار اختیار کرنا ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے کی موجودہ دور میں زندہ مثال انقلاب ایران کی ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح پڑی ہے۔

اسی مرحلے پر جہاد بالسیف کیلئے مطلوبہ شرائط پوری کرتے ہوئے حکومت وقت سے مسلح تصادم بھی مول لیا جا سکتا ہے لیکن یہ امور اس وقت کے حالات کی روشنی میں ہی طے کیے جا سکتے ہیں۔ سر دست توسیع دعوت اہم ترین تقاضا ہے اور وہ انتخابی میدان میں رہتے ہوئے ممکن نہیں کیونکہ دونوں طریقوں کی ضروریات بالکل جدا ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مولانا شیرانی کی طرح دیگر دینی سیاسی جماعتوں کے زعماء کو بھی یہ توفیق بخشے تاکہ وہ اظہار حق کی راہ میں حائل مصلحتوں کی پروا کئے بغیر کلمہ حق بلند کریں اور اس طرح ان اصحاب عزم و ہمت کی صدا پر ان جماعتوں کی قیادت طریقہ کار کی تبدیلی کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ دنیا کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم تاخیر مزید کے متحمل نہیں ہو سکتے چنانچہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام دینی قافلے صحیح تر راہ پر چل کر انقلابی تدریج میں اقامت دین کی جدوجہد پر کاربند ہو جائیں۔

مولانا شیرانی کے کلمہ حق میں رفقاء تنظیم اسلامی اور معاونین تحریک خلافت کے لئے ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے امیر محترم اور داعی کی پیہم دعوت کے ثمرات اس عملی بیداری کی شکل میں دیکھ رہے ہیں جو دینی سیاسی جماعتوں کے Inner Core میں پیدا ہو رہی ہے۔ اگر یہی دینی جماعتیں نبویؐ نہج پر عمل کرنے کے لئے کمر ہمت کس لیں تو نحوا المطلوب ورنہ ہمارے ذمہ تو اپنی بساط کے مطابق صدائے حق لگاتے رہنا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ایک منظم قافلہ تیار ہو جائے گا جو نظام باطل کے نگہبانوں کو للکار سکے۔ بصورت دیگر اللہ کے ہاں ہم معذرت تو پیش کر ہی سکیں گے۔○

بقیہ افتتاحیہ

ہوں گے۔ کیا دفاع وطن بھی کوئی کاروبار ہے جس سے روپے پیسے کی شکل میں منافع کی امید رکھی جائے؟۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے تو سودی لین دین کے صرف دو پہلوؤں پر بات کی کیونکہ ظاہر ہے کہ خطاب جمعہ میں انہیں دوسرے موضوعات سے بھی گزرنا ہوتا ہے لیکن اس کا تیسرا پہلو --- یعنی سودی قرضے لینے والوں کا رویہ ------ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ مختلف نہیں۔ ہو یہ رہا ہے کہ صنعت کار' تاجر اور سرمایہ دار اپنی ذاتی دولت کو تو' وہ کالا دھن ہو یا سفید' بنک کو بہتر شرح پر فکسڈ ڈپازٹ میں یا ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ جیسی "بچت" کی بہترین شرح سود والی سکیموں میں لگا دیتے ہیں اور صنعت یا تجارت کے فروغ کے لئے بالعموم رعایتی شرح پر (اور بھاری شرح کا بھی ان کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کی صحت پر بوجوہ کوئی برا اثر نہیں پڑتا) بنکوں سے قرضے لیتے ہیں تو اس لئے کہ اولاً اکثر منصوبوں میں حکومت خود سودی کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ثانیاً سود کو صنعت کار یا تاجر اپنے منافع میں سے نہیں ادا کرتا بلکہ اسے اپنے ان اخراجات میں شامل کرتا ہے' جو ٹیکس کے موجودہ نظام میں محصول سے مستثنیٰ ہیں۔ گویا اپنے راس المال سے کام کرے تو سرمایہ کار کو پورے منافع پر انکم ٹیکس دینا ہوتا ہے لیکن قرضوں کی صورت میں سرمائے کے بڑے حصے کے سود پر یہ ٹیکس معاف ہے۔ ہر معاملے کو چار پیسے کے فائدے کے پیمانے سے ماپنے والے ہمارے کاروباری طبقے کے لئے اس میں بڑی دلکشی ہے اور سب سے زیادہ مفاد ان کا اس امر سے وابستہ ہے کہ شراکت و مضاربت کی شکل میں تو منافع کے اس حصے پر بھی بات ہو گی جو وہ خود رکھنا چاہتا ہے لیکن سودی قرضوں میں اس پر کوئی پوچھ گچھ نہیں۔ وہ اس سرمائے پر ایک متعین شرح سے سود ادا کرنے کے بعد پوری طرح آزاد ہوتا ہے کہ اپنی صنعت یا تجارت سے جو جائز و ناجائز مفاد چاہے اٹھائے' ذخیرہ اندوزی کرے' چور بازاری کرے اور مصنوعی مہنگائی پیدا کر کے افراط زر کی افزائش کو دعوت دے۔

واقعہ یہ ہے کہ سود نظام معیشت کی سب سے بڑی نحوست ہے جو اپنے جلو میں دو لعنتیں اور بھی لاتی ہے' بے روزگاری اور افراط زر۔ اس کا متبادل ایجاد کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاں' سودی مالیاتی نظام کے متبادل پر بات ہونی چاہیے' متعدد سطحوں پر ہوئی بھی اور تا حال جاری بھی ہے اور اصل مسئلہ تو نیت کی صفائی اور ارادے کی استواری کا ہے۔ سود نے ہماری معیشت میں سرمایہ پرستی' بدعنوانی' قومی مفادات سے چشم پوشی' اور لالچ و خود غرضی کا جو منحوس چکر چلا دیا ہے اسے چلتا دیکھنے کی آرزو رکھنے والوں کا منصوبہ یہ ہے کہ سود کے مسئلے پر شور و غل' کج بحثی اور کٹ حجتی کے رویے کو اس درجہ عام کیا جائے کہ کوئی یک سوئی سے معاملے کی نوعیت پر سوچنے کی مہلت ہی نہ پائے اور نیت کی صفائی' پھر ارادے کی استواری تو ظاہر ہے کہ سوچ سمجھ کر کسی بات کو قبول کرنے کے بعد ہی پیدا ہوا کرتی ہے۔

۔ لیکن قوم نے دیکھا کہ اسلامی نظام آجانے کے باوجود یہ تمام برائیاں پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہیں ۔ قوم کے وافر حصے کو یقیناً سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ اسلام کے پاس بھی ہمارے مسائل کا کوئی حل نہیں ۔ اسلام کا جو تھوڑا بہت بھرم قائم تھا وہ ضیاء الحق صاحب کے دور میں جاتا رہا ۔

ہمارے ارباب اقتدار کے پاس البتہ ایک چیز ابھی باقی ہے جس سے قوم کی شکستہ کشتی کو دھکیلتے جارہے ہیں اور یہ ہے یوم آزادی کو زور و شور سے منانا ۔ ضیاء الحق صاحب نے بھی اسے اہم دینی فریضہ سمجھ کر زور و شور سے نبھایا اور اب بھی دیگر ہزار ہا درپیش مسائل کو پس پشت ڈال کر اسے فرض کا درجہ دیا جارہا ہے ۔ خدا کرے کہ یہی ایک ذریعہ ہمارے مسائل کا حل بن جائے ۔ زندہ قومیں اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے یوم آزادی کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور اپنی خود احتسابی کا ذریعہ بناتی ہیں ۔ ہمیں بھی اسے اپنا یوم حساب بنانا چاہیے تاکہ کم از کم سال میں ایک بار اپنے ماضی اور حال کا احتساب کر کے اپنے مستقبل کا تعین کرسکیں ۔ ورنہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وقت کا کوڑا اور تاریخ کا فیصلہ کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتے ۔ اگر کھیلوں کو فروغ دے کر ' ذرائع ابلاغ کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنا کر اور یوم آزادی کو زور و شور سے منا کر قوم کو اصل مقاصد سے ہٹانا اور میٹھی نیند سلادینا مقصود ہے تو خدارا قوم سے یہ مذاق بند کیجئے اور قائد اعظم کے پیش کردہ دو قومی نظریہ کی تکمیل ہونے دیجئے ۔

خبر کشائی

میم سین

○ نگران حکومت کا وزیراعظم بن کر غلطی کی تھی ۔ صدر اور بینظیر کے درمیان غلط فہمیوں کا بھی ذمہ دار ہوں (جتوئی)

☆ کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ۔ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

○ دھکا دینے آئی ہوں (بینظیر)۔ دھکے کی سیاست نہیں چلے گی ۔ (نواز شریف)

☆ اس دھکم پیل میں عوام کا تو کچومر نکل جائیگا ۔

○ ہمارے ہزاروں کارکن جیلوں میں زندگی گزار رہے ہیں (الطاف حسین)

☆ آپ کو "قوم کا غم تو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ" ۔ لندن کی آسائش چھوڑ کر آیئے تو یہاں کی بپتا کا پتہ چلے ۔

○ پچھلے حکمراں اناڑی اور نئے حکمراں بدعنوانیوں میں ماہر ہیں (جتوئی)

☆ فاؤل پلے میں تو آپ بھی کسی سے کم نہیں رہے ۔

○ پی آئی اے میں ریفرنڈم کے لئے ایم کیو ایم اور جماعت اسلامی میں معاہدہ (ایک خبر)

☆ آئی جے آئی کے بعد اب پی آئی اے کی باری آئی ' میرے مولا ہے تیری دہائی ۔

○ ایم کیو ایم آزادی صحافت کا احترام کرتی ہے ۔ (عظیم طارق)

☆ "جنگ" اور "ڈان" کا بائیکاٹ احترام ہی کا ایک انداز تھا!

○ رشوت دینے والا نہ ہو تو رشوت خود بخود ختم ہوجائے گی ۔ (مظفر علی شاہ)

☆ عوام میں عزم تو موجود ہے لیکن انہیں اپنے کام کرانے تو ہوتے ہیں!

○ نوجوانوں کی صحیح تربیت نہ ہوئی تو امت کے کام ادھورے رہ جائیں گے ۔ (نواز شریف)

☆ نوجوانوں کی مناسب تربیت کا اہتمام ہے کس کے ذمے ؟

○ تھانیدار قبضہ میں لی گئی تیس ہزار تولہ چاندی لے کر فرار ہوگیا ۔ (ایک خبر)

☆ گویا تھانیدار کی چاندی ہوگئی ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکام اس تھانیدار پر چاند ماری کب کرتے ہیں ۔

کہتی ہے مجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا!۔۔۔۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا ۔ اس ملک کو قائم کرنے میں لاکھوں مردوں ' عورتوں اور بچوں نے اپنی جانیں اس لئے قربان کیں کہ مسلمانوں کو ایک ایسا خطہ زمین حاصل ہوجائے جہاں وہ امن اور چین سے زندگی بسر کرسکیں ۔ برطانوی دور حکومت میں مسلمان عوام سب سے زیادہ استحصال کا نشانہ بنے تھے اس لئے وہ ہندو اکثریت کے مقابلے میں زندگی کے تمام شعبوں میں پیچھے جاچکے تھے چنانچہ اپنے خلاف ہونے والی ناانصافیوں ' غربت اور خوف و ہراس سے نجات حاصل کرنے کے لئے مسلمان ایک علیحدہ ملک کے لئے مطالبہ کرنے میں حق بجانب تھے تاکہ مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو اور حق و انصاف کا بول بالا ہو ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا پاکستان کے قیام سے یہ مقاصد حاصل ہوگئے ؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے ۔ پاکستان در اصل حاصل کیا گیا تھا اسلام کے نام پر ' مگر اس میں قوانین وہی برقرار رکھے گئے جن کے ذریعے انگریز نے وہاں حکومت کی تھی ۔ لہٰذا کوئی فرق واقع ہونا بعید از قیاس تھا چنانچہ مسلمانوں نے اس کا یہ حل ڈھونڈا کہ پاکستان کو تقسیم کر کے دو الگ حصے بنا ڈالے ۔

پاکستان کو قائم ہوئے پینتالیس برس ہوچکے ' اس کے دو ٹکڑے بھی ہوگئے ' مسائل بڑھتے بڑھتے بھیانک شکل اختیار کرچکے ہیں اور ابھی روز افزوں ہیں مگر اسے کیا کہیے کہ یہاں کے مسلمان اس کا حل بھی "تقسیم" ہی کو سمجھتے ہیں ' "سندھو دیش" اور "جناح پور" وغیرہ کی شکل میں ۔ حالانکہ معمولی ذہن کا آدمی بھی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ محض تقسیم ملک اگر مسائل کا حل ہوتی تو پاکستان کے قیام کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں باگ ڈور آئی تھی ' وہ کیا اتنے ہی نااہل تھے ؟

حضورؐ نے فرمایا جو کوئی عصبیت ' کی دعوت دیتا ہے ' عصبیت کے لئے جنگ کرتا ہے یا عصبیت کے لئے مارا جاتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ۔ مسائل کا حل تفرقہ اور تقسیم میں نہیں ' اسلام کے نفاذ میں ہے ۔ کہیے پاکستان زندہ باد ' نہیں اللہ اکبر!"

("Khilafah" London شمارہ جولائی ۱۹۹۲ء سے ماخوذ)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36 -K,Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

آوازِ دوست

"یہ قوم قرآن کو مہجور
کرنے والی قوم ہے"

ڈھاکہ ' بنگلہ دیش سے طٰہٰ بن حبیب صاحب کے ڈاکٹر اسرار احمد کے نام ایک حالیہ طویل خط سے ایک اقتباس:

" آپ نے اواخر رمضان المبارک کو جو خط ارسال فرمایا تھا اس میں ذکر فرمایا تھا کہ گذشتہ ۲۷ر رمضان المبارک کو پاکستان کو وجود میں آئے ہیں ۴۶ سال مکمل ہوگیا ' ہم اور آپ جس قوم کو رجوع الی القرآن کی دعوت دے رہے ہیں یہ قوم قرآن کو مہجور کرنے والی قوم ہے اسلامی قمری کیلنڈر ترک کر کے وجود میں آئی اور اسی میں چل رہی ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ان کو ملنے والی تیئس سالہ مہلت شمسی تیئس سال ہی ہو ۔ پہلی مدت جس میں پاکستان دو لخت ہوا وہ بھی تو شمسی تیئس سال تھا ۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ہم کو اپنا جدوجہد کے لئے شمسی ۲۳+ ۲۳ ۔ ۴۶ میں مزید ڈیڑھ سال ملے ' واللہ اعلم"

" مذہبی افتراق و اختلاف اور تعالید کی دیواریں امت واحدہ کے قیام کی راہ میں سب سے بڑا مانع ہے اس کی کسی بھی ایک شکل پر قائم رہ کر ' یا ساری شکلوں کو اکٹھا کر کے امت واحدہ اور اس کی خلافت قائم نہیں ہوگی ان ساروں سے اپنا وجود کو پاک کرنے کے بعد ہی اس کی اہلیت کی امانت من جانب اللہ عطا ہونے لگ جائیگی۔ ان سب کو اللہ کی راہ میں متحدہ لائحہ عمل کے لئے راضی کرنے کی کوشش عبث ہے ۔ یہ اگر کسی کو آج کسی مصلحت وقت پر دستار فضیلت باندھ دیتے ہیں تو کل مصلحت پر ناراض ہو کر اسے دستار فضیحت میں بدل دیں گے ۔ اس ضمن میں یہاں ایک واقعہ بیان کرنا میرے خیال میں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ۱۹۷۹ء کا واقعہ ہے کہ تحریک جمہوریت کے ایک جلسہ عام میں راولپنڈی لیاقت باغ میں مرحوم مولانا مودودی جو بہترین مقرر تھے ہی ' اس دن معمول سے بڑھ کر تقریر کی ۔ ان کی اس تقریر کے بعد صحیح معنی میں اور کسی کو تقریر کرنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ اس جلسہ عام میں مرحوم چودھری محمد علی ' نور الامین اور میاں دولتانہ جیسے مشاہیر سیاست موجود تھے ' آخر میں میاں دولتانہ تقریر کے لئے کھڑے ہو کر مولانا کی تقریر کی تعریف کر کے یوں گویا ہوئے کہ مولانا کی تقریر کے بعد دوسری تقریریں دیوان غالب سننے کے بعد امام دین گجراتی کے دیوان سنانے کے مترادف ہوگا ۔ اختتام جلسہ کے بعد عشائیہ پر مولانا کی تقریر کا چرچا ہورہا تھا ۔ مسلم لیگیوں نے یہاں دولتانہ سے کہا کہ آپ نے مولانا کی تقریر کی جو تعریف بر سر عام کی ہے اس سے تو لگتا ہے آپ جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے اور مسلم لیگ کی علیحدہ وجود کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی ۔ جواب میں دولتانہ نے کہا کہ جماعت کی تنظیم اچھی ہے ۔ اس کا منظم ورکنگ فورس ہے ' مولانا کی تقریر بھی بہت سود مند ہے جس سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہیے مگر جب الیکشن کا وقت آئے گا تب جماعت کو پچھاڑنے کے لئے ایک جملہ ہی کافی ہوگا کہ جماعت اسلامی قیام پاکستان کا مخالف تھی ۔ اس پر سارے مسلم لیگی زور دار قہقہہ لگائے ۔ دوسرے ایک کونہ میں جمعیت علمائے اسلام اور نظام اسلام پارٹی کے حضرات مولانا کی معرکۃ الآرا تقریر اور جماعت اسلامی کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ پر تبصرہ کر رہے تھے ۔ اس وقت ایک بزرگ چاروں طرف نظر دوڑا کر جب دیکھا کہ قریب میں کوئی جماعتی حضرت موجود نہیں ہے تو ہاتھ اٹھا کر دعا کی شکل میں یوں گویا ہوئے ' یا اللہ اگر جماعت اسلامی کو اقتدار سونپنا آپ کی مشیت میں ہو تو ہم کو اس سے پہلے دنیا سے اٹھا لینا ۔ یہ دو واقعہ سے مجھے ایسا گھن آگیا تھا کہ اس دورہ میں ہم نے جلسوں میں شرکت اور اس میں تقریر کرنے سے اجتناب کرتا گیا اور اسی سال عملی سیاست سے بالکل کنارہ کش ہوگیا"

بنگلہ دیش کے جناب امام الدین محمد طٰہٰ ہمارے مستقل قارئین کے لئے اجنبی نہیں ہیں ۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نام انہوں نے اپنے دوسرے طویل ترگرامی نامے میں ماہ و سال کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے حساب سے اتفاق کیا ہے ۔ اس موضوع پر ان کے خط سے ایک مختصر پیرا اور پاکستان کے سیاستدانوں کی "حکمت عملی" پر ان کا ایک مشاہدہ قارئین کی دلچسپی ... نہیں 'نوحہ خوانی ... کے لئے پیش کیا جارہا ہے ۔ ان کی زبان میں معمولی سی لیکن ضروری اصلاح اس لئے نہیں کی گئی کہ پڑھنے والے اس کے اصل ذائقے کا ہی مزا لیں تو بہتر ہے ---- مدیر